ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس شناوری کی تعلیم میں یہ بات نہیں رہی ؟

یہی حال عام دنیائی علم و فن کا ہے، کہتے ہیں قبل اسلام یونانی و مصری و ہندوستانی و مجوسی و رومی قومیں اس کو جانتی تھیں، لیکن جاننا اور بات ہے۔ اور فن کی حیثیت پیدا کرنا اور بات ہے۔ علم اور اسلام نے دوش بدوش ترقی کی۔ اور یہ ترقی اُس زمانہ میں مکمل ہوئی جب شیخ الرئیس ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا البخاری کی تحقیقات نے علم میں حقیقی علمیت کی شان پیدا کر دی ؟

بوعلی سینا کا ہمہ گیر علمی ذوق بھی اسلام کے افعال و خواص کا مظہر العجائب تھا ایک حیثیت دیکھو تو سلطنت کے وزیر اعظم ہیں۔ ملکی انتظام میں مصروف رہتے ہیں سیاسی پیچیدگیاں سلجھانے کا انہماک ہر ایک چیز سے بےخبر بنائے ہوئے ہے۔ دولت و عظمت کی زندگی نے عیش و طرب کے انتہائی سامان فراہم کر رکھے ہیں، دوسری حیثیت کو دیکھنا چاہو تو دل و دماغ علمی تحقیقات میں سرگرم ہے۔ قید خانے میں حکمت و فلسفہ کی کتابیں تالیف ہو رہی ہیں۔ پردیس اور جلاوطنی کی بے سروسامانی میں ایجاد و اختراع کا زور ہے۔ خانہ بدوشی کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ مگر جہاں مقام ہوا مطب بھی شروع ہو گیا۔ مریض عشق کی تشخیص بھی محض نباضی سے کر لی۔ اور کتابیں بھی صرف یادداشت اور وجدان صحیح کی مدد سے تصنیف ہونے لگیں۔ کیا یہ خصوصیت دنیا میں اور بھی کہیں نظر آسکتی ہے اور کیا اس باب میں کوئی دوسری قوم بھی مسلمانوں کی حریف بن سکتی ہے ؟

علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء (جلد دوم صفحہ ۲۰۹) میں ابوعلی سینا کے جو حالات لکھے ہیں ہماری قوم کے لئے سرمایۂ عبرت ہیں ابوعلی سینا ایک وقت میں بادشاہ علاء الدولہ کاکویہ کے وزیر اعظم تھے اسی وزارت کے دوران میں علم ہیأۃ کی تحقیقات کے لئے اُنھوں نے ایک رصدگاہ قایم کی۔ جس میں نظم

آٹھ برس تک علم ہیأت کے تجربے کرتے رہے۔ قدما کی بہت سی غلطیاں درست کیں کرۂ آفتاب وعطارد و زہرہ کے نظام و ترتیب کے اختلافات رفع کئے۔ زمانہ بیں اس حیرت انگیز اکتشاف کا جس پر یورپ کی علمی دنیا نے آج سربلند عمارتیں بنالی ہیں اُنہیں کو فخر حاصل ہے کہ "زہرہ وعطارد چہرۂ آفتاب پر دو سیاہ تلوں کی طرح نظر آتے ہیں" اس اکتشاف سے اُنہوں نے ثابت کیا کہ:۔

(۱) زہرہ وعطارد کے کُرے کرۂ آفتاب کے نیچے ہیں؂

(۲) زہرہ وعطارد کے کُرے بذاتہ روشن نہیں ہیں ورنہ سیاہ نظر نہ آتے؂

(۳) کرۂ ماہتاب کی طرح زہرہ وعطارد کی روشنی بھی گھٹتی بڑھتی ہے۔ کیوں کہ یہ سیاہی بتدریج پیدا ہوتی ہوگی؂

آلات اور کلین ایجاد کرنے میں بھی اُن کو خاص مہارت تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف علمی فلسفہ کے شوقین نہ تھے بلکہ اُن کا فلسفہ عملی بھی تھا۔ صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ "رصد کے متعلق انہوں نے ایسے ایسے آلات ایجاد کئے تھے کہ اُن سے پیشتر کوئی موجد ویسے آلے بنا نہ سکا تھا"۔ مگر افسوس ہے کہ اُن آلات کے حالات سے تاریخیں خاموش ہیں اور لاعلمی کے تاریک پردہ نے ساری حقیقتیں چھپا رکھی ہیں؂

ہندوستان کو حضرت مولوی ظفر علی خاں بی اے کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ جو اس وقت ملک میں سچی حریت اور صحیح بیداری کے روح رواں ہیں بوعلی سینا کے متعلق یورپ نے جو مبسوط و مفصل تذکرے لکھے ہیں اور انسائیکلوپیڈیا برطانیکا میں اُن کی علمی زندگی

اور وہ خود کس قدر علم سے بیگانہ ہیں یہ کتاب مسلمانوں کو بتائے گی کہ یورپ اُن کے بزرگوں کو کس عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور خود اُن کی وقعت اُس کے دل میں کیا ہے؟

ولا زال اهل الغرب یدرون قدرنا
مدى الدهر ما ابدوا من الفضل معجما

ہماری قدر کے قایل رہیں گے اہل فرنگ
فضائل اور معارف ہیں تا بروز قیام

متى ذكر الافضال فيهم خطيبهم
على منبرٍ صلى علينا وسلما

جو کچھ ار کرے ذکر علم و دانائی
تو بھیجتا ہے ہمیں پر درود اور سلام

(عمادی)

لاہور-۲-اپریل سنہ ۱۹۱۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# بوعلی سینا

جب کسی سلطنت کا رقبہ اسقدر بڑھ جاتا ہے کہ شخصی حکومت ہونے کی صورت میں بادشاہ وقت یا جمہوری حکومت ہونے کی صورت میں جماعت حکمران اُس کے مرکز سے ہٹے ہوئے حصوں کا خاطر خواہ انتظام نہیں کر سکتی تو سلطنت کے اجزا میں انقراض و انقطاع ہونے لگتا ہے۔ دسوین صدی عیسوی کے ختم پر سلطنت اسلام کی بھی یہی حالت ہو چکی تھی اور اُس کی قوت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں متعدد اسلامی حکومتیں علیحدہ علیحدہ قایم تھیں جن میں سے بعض مثلاً اسپین اور بخارا۔ بڑی سطوت و جبروت کی تھیں۔ لیکن وہ طاقت جس نے خلفائے عباسیہ کے دور اول تک اسلام کو ایک مرکز پر جمع کئے رکھا تھا مٹ چکی تھی۔ خراسان اور ایران کے وسیع علاقے جو اس وقت تک بغداد کے ماتحت چلے آتے تھے خلافت بنی عباس کے روزافزوں ضعف اور انحطاط کے باعث ان کے قبضہ سے نکلتے چلے اور طاہر بن محمد

قایم کرلی اور اکثر

ایران بہت سے سرکش امیرون کی بغاوت کی جولانگاہ بن گیا۔

اس پرآشوب زمانہ میں جبکہ دنیاوی لحاظ سے مسلمانوں کی حکومت کے اجزا پراگندہ ہو رہے تھے اور مختلف خودمختار حکومتیں جابجا قایم ہوتی جاتی تھیں جو کسی دوسرے کے آگے سر جھکانا عار سمجھتی تھیں مسلمانوں میں ایک ایسا شخص پیدا ہونیوالا تھا جس کے مقدر میں اپنے زمانہ کی علمی دنیا کی شہنشاہی لکھی تھی- اور جس کی عقل دقیقہ سنج کی ہوشگافیاں نہ صرف اوس کی اپنی قوم بلکہ عیسائی دنیا کو صدیوں تک محو حیرت رکھنے والی تھیں- اس شخص کا نام ہے ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا ہمارا ارادہ ہے کہ اپنی ناچیز بساط کے موافق اس حیرت انگیز شخص کے عقلی کارناموں پر ایک مختصر سی نظر ڈالیں لیکن پہلے ہم اپنے ناظرین کی واقفیت کے لئے اس کی زندگی کے کسی قدر حالات بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں

مخفی نہ رہے کہ ہمارے مضمون کا یہ حصہ محض سلسلہ واقعات قایم رکھنے کی غرض سے قلمبند کیا جا رہا ہے- ورنہ اس سے پہلے بھی اردو زبان میں بوعلی سینا کی سوانح عمری پر ایک آدھ مضمون لکھا جا چکا ہے- ہماری اصلی غرض ابن سینا کی عقلی زندگی پر ریویو کرنا ہے اور اس کام کو شاید اب تک ہمارے ملک میں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہم جانتے ہیں کہ یہ کام جو ہم نے شروع کیا ہے اپنی اہمیت کے لحاظ سے وسیع تر معلومات اور زیادہ تر دقت نظر کا محتاج تھا- لیکن جو خیال ہمکو اس مضمون پر اس وقت قلم اٹھانے پر آمادہ کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ جو فروگذاشتیں ہم سے ہوں گی اونکی تلافی کوئی دوسرا کر دے گا-

بوعلی سینا علاقہ بخارا کے ایک چھوٹے سے گاؤں افشنہ میں سنہ ۹۸۰ء میں پیدا ہوا- ماں وہیں کی تھی باپ بلخی الاصل تھا اور سلسلہ سامانیہ کے امیر نوح ابن منصور کے ماتحت محصلی کی خدمت پر مامور تھا- اس زمانہ میں حکومت سامانیہ جنوب کی طرف سے محمود غزنوی

بوعلی کی پیدائش کے کچھ سال بعد اوس کے ماں باپ بخارا کو ہجرت کر گئے جو اوس زمانہ میں علم و فضل اور کمال و ہنر کا مرکز تھا۔ باپ نے بیٹے کو اتالیق کے سپرد کیا جس کا نام شیخ اسمٰعیل زاہد تھا۔ اور چند ہی دنوں میں اس ہونہار بچہ نے وہ ہاتھ پاؤں نکالے کہ اہل بخارا حیران رہ گئے۔ دس برس کی عمر میں پورا قرآن حفظ کر لیا اور اوس کے علاوہ مشاہیر شعرائے عرب کا متفرق چیدہ کلام اوس کی نوک زبان ہو گیا۔ ایک سبزی فروش سے اوس نے حساب سیکھا اور ایک خانہ بدوش عالم ابو عبد اللہ ناتلی سے مختلف علوم و فنون کے ابتدائی اصول تحصیل کئے۔ پارفری (فرفوریوس) کی کتاب ایساغوجی اور اقلیدس کے پہلے مقالہ کی پانچ شکلیں بوعلی سینا نے اوسی سے پڑھیں لیکن شاگرد کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اُستاد میں اوسکے پڑھانے کی قابلیت بالکل باقی نہیں رہی۔ چنانچہ اوس نے بطور خود شرحوں اور تفسیروں کی مدد سے کتابیں پڑھنی شروع کیں اور زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ منطق تحریر اقلیدس اور المجسطی پر حاوی ہو گیا۔ ابھی اوسکی عمر سولہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نہ صرف علم طب کے نظری اصول سے اوسے واقفیت تامہ حاصل ہو گئی بلکہ جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے مریضوں کا اونکے گھر پر جا کر مفت علاج کرتے رہنے سے اوس نے علاج کے متعدد نئے طریقے بھی دریافت کر لئے۔ علم طب کے ابتدائی اصول اوس نے ایک نصرانی عالم عیسیٰ ابن یحییٰ سے تحصیل کئے تھے لیکن اوسکی خداداد طبیعت اس فن میں بھی بہت جلد اُستاد کی مدد سے مستغنی ہو گئی۔ اس کے بعد ڈیڑھ سال تک وہ فلسفہ کے مسائل نامعلومہ کے اکتساب و حل میں مشغول رہا۔ لیکن اس کٹھن راہ میں اوسنے بیشمار رکاوٹیں پائیں۔ اس زمانہ میں اوس کی محنت و شغف کی یہ کیفیت تھی کہ رات رات بھر چراغ جلائے بیٹھا رہتا تھا اور جب نیند آتی تھی تو کوئی دافع النوم عرق پی لیا کرتا تھا۔ خواب میں بھی فلسفہ کے مسائل اوسکی عقل عاملہ کے سامنے چکر لگایا کرتے تھے اور بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ اسی

... ارسطو کی کتاب
مابعد الطبیعات پڑہی یہانتک کہ ایک ایک لفظ اوسکے حافظہ پر نقش ہو گیا۔ مگر ارسطو کے خیالات اور انکا طرز ادا ایسا مغلق و دقیق تھا۔ کہ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ ایک دن اوس کا گذر ایک کتب فروش کی دکان پر ہوا۔ پرانی کتابوں میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کو الفارابی[1] کی شرح ارسطوطلی جسے اوسنے تین درہم میں خرید لیا۔ اس شرح نے اوس عقلی دھندلکے پر جس میں وہ اتنے عرصے سے راہ ٹٹولتا پھرتا تھا پوری روشنی ڈالی جس سے اوسکو ایسی خوشی ہوئی کہ بے اختیار زمین پر گر کر سجدہ شکر بجا لایا اور محتاجوں کو بہت کچھ خیرات دی۔ القصہ اپنے عمر کے سترھویں سال میں اوسنے جملہ علوم رائج الوقت پر عبور حاصل کر لیا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد معلم اول کا جانشین بننے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ امیر بخارا تک اوسکی شہرت پہلے ہی پہونچ چکی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اندنوں امیر ایک سخت مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اور اوسنے نوجوان طبیب کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ بو علی سینا نے مرض کی کامل تشخیص کی اور مریض کو شفا ہو گئی۔ اسکے صلہ میں امیر نے اوس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔ اب اوس کو موقع ملا کہ امیر کے گراں بہا کتب خانہ میں جو قیمتی کتابیں جمع تھیں اون کے مطالعہ سے اپنی معلومات بڑھائے۔ سلسلہ سامانیہ کے تاجدار علم و فضل کی سرپرستی کے لحاظ سے مشہور تھے اور اوس زمانہ میں بادشاہوں کے شکوہ و تجمل کا یہ بھی ایک لازمہ ہوتا تھا کہ اون کے دربار میں مشاہیر علماء وقت کا مجمع رہے یہانتک کہ جب بادشاہ فوج کشی کرتا تھا۔ تو اوس حالت میں بھی علما اوس کے ہمرکاب رہتے تھے۔ یہ طریقہ ایسا عام ہو گیا تھا۔ کہ تیمور اور ہلاکو جیسے سفاک اور خونخوار تاجدار بھی جن کو قدرتی طور پر علم سے مس نہ ہونا چاہئے تھا۔ اپنے زمانے کے مشہور علماء و فضلا کو دوران فوج کشی میں بھی اپنے ساتھ

---

[1] الفارابی کے حالات انشاءاللہ کسی آئندہ رسالہ میں طبع کئے جائینگے۔

محمود غزنوی نے اپنے دربار میں جن وحید العصر لوگون کو جمع کر رکھا تھا اونکے تبحر اور کمالات کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ابوریحان بیرونی[1] اور فردوسی جیسے لوگ اون میں موجود تھے ؛

جب سنہ ۱۰۰۰ء میں سامانی خاندان کا خاتمہ ہوگیا تو محمود غزنوی نے بوعلی سینا کو بھی اپنے دربار میں طلب کیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اوس نے اس دعوت کو منظور نہیں کیا۔ دولت سامانیہ کے انتزاع پر بوعلی سینا خیوا چلا گیا جہاں کے وزیر نے جو بڑا علم دوست تھا۔ اوسکا ایک قلیل درماہہ مقرر کردیا۔ لیکن چونکہ یہ تنخواہ اسقدر قلیل تھی۔ کہ اوسکی اوقات بسری کو کافی نہیں ہوتی تھی لہذا اوس نے دوبارہ نیشاپور کا رخ کیا تاکہ وہیں جاکر قسمت آزمائی کرے اوس انقلاب عظیم میں جو خلافت عباسیہ کے دور آخر میں برپا ہوا اور جس نے خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے کردئے ایران جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ متعدد خودسر امیروں کی شورش کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں یہ امر قرین احتمال نہ تھا کہ علوم و فنون کی ترویج یا اہل علم و فن کی قدردانی ہو اس خانہ جنگی اور طوایف الملوکی کی نوبت یہانتک پہونچ گئی کہ ویلم کا روشن خیال اور ہنر پرور حکمران شمس المعالی قابوس جس کے دربار میں ابن سینا کو پناہ ملنے کی امید تھی خود ان خانہ برانداز فسادات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یعنی سنہ ۱۰۱۲ء میں شمس المعالی کی فوج نے باغی ہوکر اپنے امیر کو فاقے دے دے کر مار ڈالا ؛

اس زمانہ میں خود بوعلی سینا بھی سخت بیمار ہوگیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اوسنے بہ تقدیر جرجان کا رخ کیا جو ساحل بحیرہ خضر پر واقع ہے۔ یہان اتفاق سے اوسکا ایک دوست ابو محمد اوس سے ملگیا جس نے اوسکو اپنے مکان کے نزدیک ایک مکان رہنے

[1] ابوریحان بیرونی کے حالات پر ایک مستقل رسالہ اردو میں ہمارے کالج کے لایق طالب علم مولوی

کو خرید دیا۔ ابن سینا نے یہاں چند دن اطمینان سے مدت اور [illegible]

دیتا رہا یہین اوسنے اوس یادگار زمانہ کتاب کی بنا ڈالی جو بعد کو تین صدیون تک یورپ کی درسگاہوں کے نصاب تعلیمی کا جزو اعظم بنی رہی اور جو اب تک بھی اسلامی دنیا کی یونانی طب کا دستور العمل اور مسیحی دنیا کی تعظیم و تحسین کا مقصود ہے یعنی کتاب القانون۔

بو علی سینا کی بےچین اور چلبلی طبیعت نے جو باوجود ہمہ دانی کے جاہ طلبی اور احتشام پرستی سے معرا نہ تھی جرجان کے اطمینان آمیز مگر غریبانہ ماحول میں اوسکو زیادہ دنون نہ رہنے دیا۔ دنیاوی ترقی کی خواہش نے اوسکو پہلے شہر رے میں پہنچایا جو موجودہ طہران کے نواح میں واقع تھا۔ اور وہان سے قزوین کی سیر کراتی ہوئی ہمدان لے گئی جہان دنیوی لحاظ سے ایک منصب جلیلہ پر سرفراز ہونا اوسکے لئے مقدر ہو چکا تھا۔ والی ہمدان ان دنوں امیر مجد الدولہ کا چھوٹا بھائی شمس الدولہ تھا۔ شمس الدولہ نے پہلے اوسکو اپنا طبیب خاص مقرر کیا اور پھر رفتہ رفتہ وزیر کر دیا۔

اس عرصہ میں طوائف الملوک کی کشاکش سیاسی طناب کو رہ رہ کر جھٹکے دیتی رہی۔ کئی حکومتیں بنیں اور کئی بگڑیں۔ بو علی سینا بھی بحر حوادث کے اس طوفان کے تھپیڑے کھاتا رہا لیکن سخت سے سخت بے اطمینانی اور پریشانی کے عالم میں بھی اوس نے ذوق اشاعت علم اور شوق توسیع تجربہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

بو علی سینا نے ۵۸ سال کی عمر پائی اور اپنی عمر کے آخری دس بارہ سال ابو جعفر علاء الدولہ کی خدمت میں گذارے جس کا وہ طبیب خاص اور مشیر علمی تھا اور جسکے ساتھ وہ متعدد فوجی مہمات میں بھی رہا۔ بو علی سینا کی اخلاقی زندگی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو اجتماع ضدین کی شان ہیں اسکی نظر آجاتی ہے جہان اوس کی عقل دقیقہ سنج اور ذہن نکتہ رس ارسطو اور افلاطون کا مقابلہ کرتا تھا وہاں اوس کی بادہ گساری اور عیش پرستی ایک اونے

[illegible]

قوتیں بہیمیت اور روحانیت کی پہلو بہ پہلو درجہ کمال میں موجود ہوگئیں۔ کیونکہ خیال یہی ہے کہ جو شخص اسقدر قوی الجذبات اور شدید الشہوات ہو اوسکے لئے منتہائے عقل انسانی پر پہونچنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہے ؛

بوعلی سینا نے ۱۰۳۷ء میں وفات پائی اور ہمدان میں کھجوروں کے ایک جھنڈ کے نیچے دفن کیا گیا ؛

؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛

؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛

یہاں تک ہم نے بوعلی سینا کی زندگی کے واقعات سے بحث کی ہے۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ اوس نے معلومات انسانی میں کیا اضافہ کیا اور علمی دنیا پر کیا اثر ڈالا جناب سرور کائنات صلعم کا ارشاد پاک ہے کہ العلم علمان۔ علم الابدان و علم الادیان اسلامی دنیا میں اشاعت فن طب کا سب سے بڑا محرک یہی قول اقدس ہوا مسلمانوں میں کوئی عالم اوسوقت تک دستار فضیلت باندھنے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک دوسرے علوم دینی و دنیوی کے ساتھ وہ فن طب میں بھی دستگاہ حاصل نہیں کر لیتا تھا اور ابتک بھی فارغ التحصیل ہونے کے لئے طب کی کتب درسیہ پر عبور حاصل کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بوعلی سینا نے جہاں فقہ۔ حدیث۔ منطق۔ معانی اور دوسرے علوم رائج الوقت پر عبور حاصل کیا۔ وہاں فن طب کے اکتساب پر بھی خاص توجہ مبذول کی ہم بھی پہلے یہی دیکھیں گے کہ فن طب میں اسے کیا درجہ حاصل ہے ؛

مسلمانوں کے علمی نشو و نما کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے ہمکو معلوم ہوتا ہے۔ کہ فتوحات سے سیراب ہونے کے بعد جب انکو دماغی ضرورتیں محسوس ہونے لگیں تو فلسفہ اور دوسرے نظری علوم کے ساتھ علمی فنون کو بھی انہوں نے یونانیوں سے مستعار لیا۔ اہل یونان

مثال اونکی دنیا میں ہمکو نہیں ملتی - اون میں ایسے ایسے علما اور ایسے ایسے قابلین فن ہو گذرے ہیں جنکے عقلی کارنامے آج تک حیرت و استعجاب اور تحسین و تعظیم کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - اس لئے مسلمانوں نے قدرتی طور پر اون کے علمی کھنڈروں پر اپنے علم کے محل کی بنیاد رکھی ؛

فن طب بھی منجملہ اون فنون کے تھا جنکے موجد اہل یونان تھے مسلمانوں نے طب یونانی کو مستعار لیکر اوس نے اپنی طرف سے اپنے ممالک محروسہ کی آب و ہوا - طرز معاشرت اور عام مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اضافہ کر لیا اور اوسکو یہاں تک اپنا بنایا کہ طب یونانی اور طب اسلامی دو مترادف جملے ہو گئے - انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں جو قوم انگریزی کا دائرۃ المعارف ہے طب اسلامی کے متعلق حسب ذیل رائے ظاہر کی گئی ہے ؛

اس میں ذرا شک نہیں کہ طب عربی زیادہ تر وہی ہے جو طب یونانی ہے - عربوں نے آنا کیا کہ دوسرے ممالک کے اختلاف آب و ہوا - طبایع و عادات اور قومی مذاق کے لحاظ سے اوسمیں کچھ تبدیلیاں کریں - اور بعض اہم اضافے بھی کئے جنکا ماخذ بلاد مشرق تھے طب عربی کا غالب حصہ بقراط - جالینوس - ویسقوریدس - اور انکے بعد کے یونانی اطبا کی تحریرات سے ماخوذ ہے - عربوں نے فنون تشریح ابدان اور ترکیب اجسام حیوانات میں ترقی معکوس کی جراحی میں وہ یونانیوں سے نہیں بڑھنے پائے - عملی طب میں انہوں نے کوئی نئی بات سوا اسکے نہیں پیدا کی کہ چند امراض کی نوعیت کے متعلق کیفیت قلمبند کر دی اصلی ترقی جو انہوں نے کی وہ فن دوا سازی میں کی اور نیز استعمال ادویات میں اس حیثیت سے کہ وہ مزیل مرض ہیں چونکہ اونکے تعلقات اہل ہند اور دوسری مشرقی قوموں کے ساتھ قائم ہو چکے تھے - لہذا اون کو بعض نئی بیش قیمت دوائیں ایسی دستیاب ہو گئیں جو آجتک اپنے نادر خواص کے لحاظ سے رائج و مستعمل ہیں - فن کیمیا میں عربوں کو دستگاہ

سب سے پہلے ترتیب دینے والے بھی ہیں اور اونہیں نے سب سے اول عطاری اور دوا سازی کے کارخانے قایم کئے بہت سی دوائیوں کے نام اور بہت سے طبی مرکبات جو آج کل مستعمل ہیں بلکہ زمانہ حال کا کل فن دوا سازی باستثنا اوس ترمیم کے جو موجودہ علم کیمیا نے اوس مین کی عربوں ہی کا ایجاد کیا ہوا ہے۔

اس رائے کے منصفانہ اور حق بجانب ہونے میں کلام نہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے۔ کہ فن جراحی کا ذکر کرتے ہوئے اوس شخص نے جس کے قلم سے متذکرہ بالا مضمون نکلا ہے مسلمانوں کی منقصت کرنے میں ذرا زیادہ سختی سے کام لیا ہے۔ فن جراحی میں جو کمال مسلمانوں نے بہم پہونچایا تھا۔ اوس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حکیم ابو القاسم زہراوی اندلسی جسکا زمانہ گیارہویں صدی ہے۔ ایک ایسی کتاب[1] کا مصنف ہو گذرا ہے جو کئی صدیوں تک علم جراحی کے متعلق یورپ میں ایک مستند اور اجتہادی تصنیف سمجھی جاتی رہی۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہمارا اصلی مقصد اقتباس مذکورہ بالا سے اول یہ بتانا تھا کہ یورپ والے مسلمانوں کی طبی خدمات کا کہاں تک اعتراف کرتے ہیں اور اوس کے بعد یہ ظاہر کرنا کہ اسلامی طب کا اصل مبدا و منشا بقراط اور جالینوس کے طبی کارنامے ہیں۔

بو علی سینا نے جو طب اسلامی کا پیشوا سمجھا گیا ہے بقراط اور جالینوس کے اصول کو اپنے مجتہدانہ فروغ کے ساتھ ایک جگہ حسن ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا۔ اور اوس میں اپنے تجربوں کا بھی اضافہ کیا۔ مثلاً ذیل کی دوائیں جنکے طبی خواص پہلے معلوم نہ تھے اوسی نے اول اول قرابادین میں شریک کیں۔ خیار شنبر۔ ریوند چینی۔ املی۔ ہلیلہ۔ ہندبہ۔ ایسی

[1] اس کتاب کا نام "التصریف" ہے اور اس کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی زبان میں ہو کر

چڑھا کر ایک دلاویز صورت پیدا کر دی +

بوعلی سینا کی طبی تصانیف کے اصولی مسائل سے بحث کرنا گویا بقراط وجالینوس کی طب کی تاریخ لکھنا ہوگا جس کی اس مضمون کی مختصر حدود میں گنجایش نہیں۔ بدن انسانی میں چار خلطوں۔ دموی۔ بلغمی۔ صفراوی اور سوداوی کا پایا جانا صحت اور مرض کا ان خلطوں کے تناسب اور عدم تناسب پر منحصر ہونا طبیعت کا خود بخود اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی استعداد رکھنا۔ اور امراض صعب کی حالت میں اخلاط کا تین حالتوں خام۔ ناضج اور بحرانیہ میں گذرنا۔ ادویہ میں چار کیفیتوں حرارت۔ یبوست۔ برودت اور رطوبت کا موجود ہونا۔ یہ تمام اصول ایسے ہیں۔ جو یونانی اطبا اور بوعلی سینا کے طریقوں میں مشترک ہیں۔ اس سے واضح ہوگا۔ کہ بوعلی سینا اتنا جدت طرازی یا ندرت آفرینی کے لحاظ سے تحسین کا سزاوار نہیں۔ جتنا اس اعتبار سے کہ اپنے دل کش اور اچھوتے طرز ادا اور طریقہ اظہار مطالب کے علاوہ اوس نے طبی معلومات کے اجزا کو جو پہلے پریشان اور پراگندہ حالت میں تھا۔ نہایت خوبی کے ساتھ ایک جگہ مرتب ومدون کر دیا +

بارہویں سے سترھویں صدی تک بوعلی سینا یورپ کا طبی استاد رہا۔ اوس کی یادگار زمانہ کتاب "قانون" جس نے اوس کو اسلامی اور مسیحی دنیا دونوں سے شیخ الاطبا کا خطاب دلوایا ۱۶۵۰ء میں لووین اور رمانٹ پلیر کی یورپین یونی ورسٹیوں میں نصاب کتب درسیہ میں شریک تھی۔ قانون شیخ پانچ مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے اور دوسرے میں شرح ترکیب اعضا و تشخیص امراض وحفظان صحت سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرے اور چوتھے میں علاج کے طریقے بتائے گئے ہیں اور پانچویں میں تراکیب وتیاری ادویہ سے بحث کی گئی ہے یہ آخری حصہ ذاتی مشاہدات اور تجارب پر مبنی ہے +

اس ذیل میں ہم جناب حاذق الملک حکیم حافظ اجمل خاں کی تحریر جو لائف کی تعریف میں انہوں

نے اس غرض سے لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

میں نے بوعلی سینا کی لائف پڑھی اور مجھے خوشی ہوئی کہ ملک کے اچھے پرچے یونانی

طب کے نامور اور ممتاز اشخاص سے ملک کو انٹروڈیوس کرانا چاہتے ہیں جس کا اثر یونانی

طب کے لئے (جس قدر بھی ہو) اچھا ہو سکتا ہے ؛

مجھ سے میرے دوست ظفر علی خاں صاحب بی اے نے خواہش کی کہ میں

بوعلی سینا کی علمی قوت اور اجتہادی عظمت پر چند سطور لکھوں لیکن جو لوگ اس قسم

کے مضامین لکھتے رہتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ آسان نہیں اس کے لئے محنت

اور وقت درکار ہے۔ اس کے علاوہ سفر میں ہوں اور میرے پاس وہ سامان بھی نہیں جو اس

کام کے لئے ضروری ہے تاہم میں چند سطور اپنے حافظ کے بھروسہ پر لکھتا ہوں اور امید

کرتا ہوں کہ علم دوست ناظرین انہیں دلچسپی کی نگاہ سے دیکھیں گے ؛

شیخ (یونانی اطبا کے گروہ میں "شیخ" سے بوعلی سینا ہی مراد لیا جاتا ہے) کی عظمت کو

ہمارے گروہ میں تمام لوگ تسلیم کرتے ہیں۔ اور اوس کے اقوال کو بڑے بڑے تقریری اور

تحریری مباحثوں میں سنداً پیش کر کے ظفریاب ہوتے ہیں کیونکہ اوس کے علمی اقوال کی

وقعت ہر ایک طبیب کے دل میں اسی طرح ہیبت اور عظمت کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے جس طرح

کہ ایک زمانہ میں "نپولین" کی جنگی عظمت کا سکہ تمام یورپ کی سلطنتوں کے دلوں میں

بیٹھ گیا تھا۔ فخر الدین رازی اور علامہ قرشی یہ دو شارح قانون کے ایسے ہیں جو اکثر اوس

کے کلام پر اعتراض کیا کرتے ہیں لیکن دونوں اوس کی جلالت قدر کا اعتراف کرتے

ہیں علامہ قرشی کی نسبت یہ بات مشہور ہے کہ جب اوس نے قانون کی شرح لکھ لی تو اپنے

آپ میں اعتراضات کرنے کی قابلیت کس شخص کی کتاب پڑھ کر پیدا ہوئی ہے؟ یہ جواب ایسا معقول تھا کہ علامۂ قرشی اُسے سنکر خاموش ہوگیا۔

"قانون شیخ" طبعی نصاب میں انتہائی کتاب ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ نے یہ کتاب لکھکر ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کو طبیب بنا دیا۔ لیکن صرف "قانون" سے شیخ کی طبی قوت کا اندازہ کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اوس نے خود اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے "ھذا مشتمل علی اقل مالا بد منہ للطبیب" (یہ کتاب بہت ہی ضروری مسائل پر جن کا جاننا طبیب کے واسطے ضروری ہے مشتمل ہے) اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ اوس کی واقفیت اور اوس کا تبحر علمی "قانون" کو اس کی طبی قابلیت کے معیار بنانے کی سفارش نہیں کرتا بلکہ اوس کا پایہ اس سے بالا سمجھنا چاہئے۔

علامۂ قطب الدین شیرازی نے قانون کی ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ اوس کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے چودہ برس کی عمر میں تمام درسی کتابیں پڑھ لی تھیں اور قانون سے بھی فارغ ہوگیا تھا۔ جراحی میں بھی سوا چند اعمال کے باقی اعمال میں بھی مہارت رکھتا تھا اور ایک شفاخانہ میں اپنی خدمات انجام دیا کرتا تھا۔ لیکن شرح قانون لکھنے سے پہلے مجھے ضرورت ہوئی کہ میں اُن چند اطبا کے حلقہ درس میں حاضر ہوں جو اوس زمانہ میں قانون پڑھانے میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ میں ہر ایک کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہر ایک سے قانون پڑھا۔ اوس کے بعد قانون کی شرح لکھنے کے لئے ارادہ کیا۔ اس واقعہ کے بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ قطب الدین جیسا فاضل "قانون" کو کس وقعت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور اس کی عظمت قطب الدین کے دل میں کس قدر تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے فن طب کی تہذیب میں اپنی روشن دماغی اور حسن مذاق کا کہاں تک ثبوت دیا ہے؛

شیخ نے ادویہ مفردہ کے فن میں دواؤں کے متعلق اصول عامہ اس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں کہ دوسری کتابوں میں جستجو کرنے سے بھی نہیں مل سکتے اسی فن میں دواسازی کے مفید قواعد بھی بہت خوبی کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ ان دونوں باتوں کے علاوہ یہ بھی التزام کیا گیا ہے۔ کہ دوا کے ہر ایک خاص فائدہ کے لئے ایک خاص رنگ مقرر کیا ہے جب وہ کسی دوا کے افعال و خواص بیان کرتا ہے اور اوس فائدہ کا ذکر آتا ہے۔ تو حاشیہ پر دو طولانی خطوں میں اوس رنگ کو بھر دیتا ہے اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی طبیب کسی خاص مرض کے لئے ایک مرکب بنانا چاہے تو وہ بہت سہولت سے ان مفرد دواؤں کو جو اس مرض کے لئے مفید ہوں جمع کر سکتا ہے اس کی مثال یوں سمجھنی چاہئے کہ اس نے زہر کے فائدہ کے لئے زرد رنگ مقرر کیا ہے پس جو دوا کہ زہر کے لئے تریاق ہوگی وہ جس سطر میں اس کے اس خاص فائدہ کو بیان کریگا اس سطر کے مقابلہ میں زرد رنگ دو طولانی خطوں میں بھر دیگا۔ اب اگر تم چاہو کہ زہر کے اثر کے دور کرنے کے لئے کوئی مرکب تیار کرو۔ اور اُن دواؤں کو منتخب کرو جن میں زہر کے دور کرنے کی خاصیت ہے تو تم حاشیہ کے زرد رنگوں کو دیکھ کر بہت ہی جلد بہت سی وہ دوائیں زہر کے دور کرنے والی بہم پہنچا سکتے ہو جن سے تم ایک مرکب تریاق بنانا چاہتے ہو اُس سے اُس نے طبیبوں کے لئے ایک خاص سہولت پیدا کر دی تھی لیکن افسوس ہے کہ نقل کرنے والوں نے اس بات کا التزام نہیں کیا۔ تاہم بعض بعض قلمی نسخوں میں یہ رنگ پائے جاتے ہیں انھیں

طبی قابلیت کا مقابلہ کیا جائے۔ جیسا کہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ خود شیخ جب آنکھ اٹھا کر متقدمین کی طرف دیکھتا تھا۔ تو اوسے طب کے میدان میں جالینوس کے سوا اور کوئی مرد میدان نہیں سوجھتا تھا۔ اس لئے وہ بھی جالینوس کو لیلائے طب کی الفت میں اپنا رقیب و حریف سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ جالینوس کے کلام پر اکثر اعتراض کیا کرتا ہے۔ اور تحقیر کے ساتھ اوس کا نام لیتا ہے۔ کہیں یہ کہتا ہے کہ "وہ فیلسوف نہیں ہے لیکن یہ چاہتا ہے کہ میں فیلسوف بن جاؤں"۔ کسی جگہ یہ کہتا ہے کہ "جالینوس نے طب میں اوس بات پر بحث کی ہے جس پر طبیعات میں بحث کرنی چاہئے تھی وہ یہ نہیں سمجھتا کہ طب میں ان مسائل سے بحث نہیں کرنی چاہئے"۔ اسی طرح کئی جگہ چوٹیں کی ہیں۔ شیخ سے پہلے چونکہ جالینوس کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس لئے اُسے ضرورت تھی۔ کہ اپنے لئے راستہ صاف کرے اور جالینوس کی وقعت کو لوگوں کے دلوں سے مٹاوے۔ لیکن جب کسی شخص کے دل میں کسی کی طرف سے سوزش ہوتی ہے تو وہ ہر ایک جگہ انصاف پر قائم نہیں رہ سکتا اور بعض مرتبہ بیجا طور پر اُوس حسد کو نکالتا ہے جیسا کہ شیخ نے ارسطو کی حمایت اور جالینوس کی مخالفت میں بہت لمبا چوڑا مضمون "شفا" میں لکھ کر اوس کا ثبوت دیا ہے۔ اور اوس میں یہ بات دار ارسطو کے مذہب کے موافق ثابت کرنی چاہی ہے۔ کہ عورت میں منی نہیں ہوتی۔ گو یہ مضمون صاف بتاتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ جالینوس کو چھیڑ رہا ہے۔ لیکن اوس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بحث جس قابلیت کے ساتھ شیخ نے لکھی ہے وہ اُسی کا حصہ ہے۔ اگر کوئی لائق سے لائق شخص بھی اس بحث کو دیکھے گا۔ تو بے اختیار یہ کہے گا۔ کہ ایک کمزور جانب کو اگر قوت استدلال سے مضبوط کیا جاسکتا ہے تو وہ اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے جیسا کہ شیخ نے کیا ہے +

(۱) جالینوس کو شیخ پر کا لمد جد ہونے کے لحاظ سے فضیلت ہے ؛

(۲) تشریح میں جالینوس نے بہت محنت کی ہے اور شیخ سے زیادہ اسے فن تشریح میں مہارت تھی ؛

ان دو باتوں کے علاوہ میرے خیال میں اور کسی اعتبار سے جالینوس کو شیخ پر فضیلت نہیں ہے۔ بلکہ شیخ کا پایہ ہر ایک لحاظ سے جالینوس سے برتر ہے۔ شیخ چونکہ متاخر تھا اور علمی ساز و سامان اوس کے پاس جالینوس سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ فطرۃً ذکی تھا۔ اور تحصیل علوم میں محنت بھی اچھی طرح کی تھی اس لئے خواہ مخواہ اوس کا پایہ جالینوس سے عام طور پر زیادہ ہی ہونا چاہئے تھا۔ اذا تساوت الاذھان والھمم فمؤخر کل صناعۃ خیر من مقدم مصلبہ (مقولہ قرشی)

بوعلی سینا کی طب پر ایک مختصر سی نظر ڈالنے کے بعد ہم اوس کے فلسفہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ؛

اس مضمون کے پہلے حصہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں نے فلسفہ کا فن یونانیون سے مستعار لیا اور اپنے علم کے محل کی بنیاد کمالات یونان کے کھنڈروں پر رکھی۔ یونانی فلاسفہ میں افلاطون اور ارسطو دو حکیم ایسے گذرے ہیں جن کی حکمت کو آج بھی منتہائے عقل انسانی سمجھا جاتا ہے۔ علی الخصوص ارسطو کی نسبت تو یہان تک کہا جاتا ہے کہ حقایق موجودات اور معرفت کنہ اشیا کے متعلق جو خیالات اوس نے ظاہر کئے ان کے لحاظ سے کوئی شخص آج تک اُس کا جواب نہیں پیدا ہوا۔ تمام قوموں نے بالاتفاق اوسکو بنی نوع انسان کا اُستاد سمجھا ہے۔ اور کوئی علم دوست قوم ایسی نہیں جس نے ارسطو کے شارحین و تابعین کا ایک بڑا گروہ نہ پیدا کیا ہو۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی جب

کرایا۔ خلیفہ المامون کی نسبت ایک روایت مشہور ہے کہ اوس نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ایک پیر مرد اوس کو فلسفہ اور دوسرے ذہنی معارف کی اشاعت کی ترغیب دے رہا ہے۔ جب مامون نے اوس کا نام پوچھا تو اوس نے کہا کہ مجھے ارسطو کہتے ہیں۔ صبح اٹھ کر خلیفہ کو اپنا خواب یاد آیا اور اوس نے ایک علمی سفارت قسطنطنیہ کے قیصر کے پاس ارسطو کی تصانیف منگوانے کی غرض سے بھیجی۔ جب یہ تصانیف آگئیں تو مامون نے حکم دیا کہ اِن کا ترجمہ عربی میں کیا جائے۔ چنانچہ بہت سے علما جو یونانی اور عربی دونوں زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے اوس کام پر مامور کئے گئے اور ارسطو کی تصانیف عربی میں آگئیں؛

ارسطو کی حکمت معجز نما سے متاثر ہو کر دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسے حکما کا پیدا ہو گیا تھا۔ جن کا یہ خیال تھا کہ عقلی و اور اکی کمالات کے لحاظ سے (جس حد تک وہ کمالات اس دنیا میں ظاہر ہو سکتے ہیں) ارسطو عقل مجسم ہے۔ بالفاظ دیگر جو کچھ ارسطو نے کہا ہے اوس میں سقم اور اعتراض کی مجال نہیں۔ اس گروہ کی وقعت و امتیاز کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ الفارابی اور خود بوعلی سینا جیسے لوگ اس میں شریک ہیں؛

بوعلی سینا اور اوس کے ہم خیال حکما کے نزدیک چونکہ یہ امر ناممکن ہے کہ ارسطو سے کوئی عقلی غلطی سرزد ہو لہٰذا اگر ارسطو کے اقوال بادی النظر میں خلاف قیاس ثابت ہوں تو اوس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہم اُن اقوال کی تہ کو نہیں پہنچ سکے نہ یہ کہ فی الحقیقت اون میں کوئی غلطی مرکوز ہے۔ اس تحریر سے ہمکو صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ارسطو کی وقعت بوعلی سینا کے دل میں کس درجہ جاگزین ہے اور ارسطو کا اوس کے فلسفہ پر کس قدر

علمی طور سے شرح وبسط کے ساتھ بحث کرنے کے قبل وہ اوس مضمون کے متعلق متقدمین
کے خیالات وآرا کو مقدمہ کی شکل میں درج کر دیتا ہے مثلاً اگر اوسے تشریح ابدان یا طب
یا مابعد الطبیعات پر کچھ لکھنا ہو تو قبل اس کے کہ خود ان مسایل پر رائے زنی کرے وہ
یہ بتا دیگا کہ ان مسایل کے متعلق متقدمین یہ رائے رکھتے ہیں ؛

ارسطو نے اشراقیہ عقاید کبھی ترک نہیں کئے۔ اوس کا قول ہے کہ کلیات اور وہ
حقایق جن کا نفس ناطقہ انسانی ادراک کر سکتا ہے فطری طور پر اون مادی واقعات و
مظاہر جزئیہ کی بہ نسبت جو حواس خمسہ کے ذریعہ سے محسوس ہوتے ہیں زیادہ سمجھ میں
آسکتے ہیں۔ مثلاً حیوان ایک ایسا ذہنی کلیہ ہے۔ جس سے ہم چڑیا کی بہ نسبت جو حیوان
کی صرف ایک قابل احساس نوع ہے بہت زیادہ مطلب اخذ کر سکتے ہیں اور جس کا
مفہوم چڑیا کے مفہوم کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ جامع ہے۔ یا مثلاً بڑائی یا طول یا آواز
ایسے حقایق ہیں جن کا تصور ایک پہاڑ یا دس انچ فیتے یا ہتوڑے اور سندان کے باہمی
تصادم کے تصور کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع الذیل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ
ہی یہ امر بھی خاص طور پر مد نظر رکھنے کے قابل ہے۔ کہ اکتشافات طبیعہ اور مشاہدہ و تجربہ
کے ساتھ اوسے ایک خاص شغف اور مناسبت تھی۔ افلاطون کے مذہب نے تصورات
وخیالات کے علاوہ باقی تمام اشیا کو غیر موجود قرار دیا تھا۔ ارسطو نے کائنات کو
اس فنائے نظری سے نجات دینے کے لئے "ممکن" کی اصطلاح ایجاد کی موجود وغیر موجود کے
درمیان گویا ایک خط فاصل یا یوں کہئے کہ ایک حد وسط ہے۔ ممکن کا وجود ہے بھی اور نہیں
بھی ... صفات سے عاری ہو اوسکی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس

صاف ظاہر ہے کہ شئے ممکن پہلے سے موجود تھی۔ اس کو ممکن کی حالت ایجابی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ارسطو کے خیال میں کائنات کی مثال ایک مسلسل زنجیر کی ہے جس کا ایک سرا ممکن محض یعنی ہیولائی (مادہ بغیر شکل یا صفات کے) ہے اور دوسرا واجب بلا شرط وعلی الاطلاق جو ہمیشہ سے موجود چلا آیا ہے۔ یعنی خدا +

ممکن وموجود کے باہمی تعلقات پر جب غور کیجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ عالم قدیم وازلی ہے۔ کیونکہ باعتبار ترتیب زمانی ضرور ہے کہ موجود ہمیشہ سے ممکن پر مقدم چلا آیا ہو۔ پودے کی حالت امکانی بیج ہے اور مرغ کی انڈا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ پودا بیج سے اور مرغ انڈے سے پہلے وجود رکھتا ہوگا۔ اسی پر دوسری چیزوں کو قیاس کرلو۔ اس طور پر ارسطو کے مذہب کے موافق علت ومعلول کا پورا نظام جس پر کائنات یا قدرت مشتمل ہے ازلی وابدی ہے جس میں اوّل تو تبدل وتغیر ہوتی ہی نہیں اور اگر قدرے تحلیل ہوتی بھی ہے تو سلسلہ سبب ومسبب کے اون دو نا قابل تعیین اجزا کی تحریک کی بدولت جنکو حوادث اور مشیئت انسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے +

ارسطو کے مذہب میں وہ نظام موجودات جس پر فلکیات مشتمل ہیں مدرک وغیرہ ہے اور اس کا کوئی فعل غرض وغایت سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر شے کے وجود کی دو علتیں قرار دیجا سکتی ہیں صوری اور معنوی۔ علت صوری کی غایت تکمیل شکل بوجود شے ہے اور علت معنوی کی غایت اوس انتہائی مقصد کا پیدا کرنا جس کے لئے وہ شے پیدا کی گئی ہے۔ مادہ ہیولائی یا امکانی سے کسی ایک عنصر یا کئی عناصر کی مدد لیکر مختلف اشیا کی شکل پکڑتا ہے۔ اور حرارت وبرودت کی عاملہ قوتیں اس تشکل میں اوس کی معین ہوتی ہیں۔ نظام موجودات کی یہ تعبیر کہ اوس میں مدرک کلیات وجزئیات ہونے

نہیں لہٰذا جو تمام موجودات سے بہ حیثیت شخصی بالکل الگ تھلگ ہے اس میں شک نہیں کہ خدا کے وجود کے متعلق ارسطو نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ مبہم اور غیر واضح ہیں کبھی تو وہ کہتا ہے کہ خدا تمام چیزون کا غیر متحرک محرک ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ سورج چاند اور ستارے اوسی کی تحریک سے جنبش میں آتے ہیں اور کبھی کہتا ہے کہ ایک قوت خیر ہے جو اپنی مشیت کاملہ سے تمام اشیاء کو تحریک پہونچاتی ہے لیکن باایں ہمہ ارسطو خدا کے وجود شخصی کا قایل ہے اور کہتا ہے کہ خدا ہر آن اور ہر لحظہ ازلی و ابدی طور پر اوس لذت سے متلذذ ہوتا ہے جو انسان کو صرف کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے حاصل ہو جاتی ہے اور اوسکے ادراک کا موضوع خود اوس کی اپنی ذات ہے اس کی دلیل ارسطو یہ پیش کرتا ہے کہ خدا جس کی ذات خیال اعظم ہے اگر اپنے سے کسی ادنیٰ تر شے کو اپنے تعقل کا مقصود قرار دے تو خیال ربانی میں تغیر اور تہاون لازم آئیگا جو محال ہے۔

انسان کے متعلق ارسطو کا یہ خیال ہے کہ اگرچہ اس کائنات عظمی کے مقابلہ میں جس کے آثار شش جہت میں پائے جاتے ہیں امور انسانی نسبتاً بالکل کم وقعت اور ہیچ میرز ہیں۔ پھر بھی دائرہ قدرت کے اندر اوس کو قدرت کا اشرف ترین حاصل سمجھنا چاہئے اور اوسپر من حیث اوس مقصد واحد کے نظر ڈالنی چاہئے جس کی تکمیل کے لئے قدرت کے باقی تمام انتظامات وسائل کا حکم رکھتے ہیں۔ بلکہ انسان کا درجہ اس سے بھی کسی قدر افضل ہے اور اوس کو ایک حد تک فوق القدرت سمجھنا چاہئے ارسطو کہتا ہے کہ ہر فطری روح ایک وجود جسمانی کا مظہر انتہائی ہوا کرتی ہے جو اوس سے مشابہت اور مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن انسان کی روح میں کوئی چیز ایسی ضرور ہے

ناطقہ اشتراک رکھتی ہو جس سے مدرکات کو بہ تمام قریب ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان انفرادی حیثیت سے بقاے دوام کا بھی متوقع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق برخلاف افلاطون کے جس نے ایک آنے والی زندگی کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور دوزخ و اعراف وبہشت کی پُر اثر تصویریں کھینچی ہیں ارسطو کچھ نہیں کہتا۔ ارسطو نے عقل کی دو قسمیں قرار دی ہیں فاعلہ اور منفعلہ عقل فاعلہ جس کو عقل عالمہ بھی کہتے ہیں۔ اور جو محض کلیات کا ادراک کرتی ہے غیر فانی ہے اور عقل منفعلہ فانی۔ لیکن اگر عقل منفعلہ جس سے قویٰ کا وہ مجموعہ مراد ہے جو احساس و ادراک مرئیات کے بعد دماغ میں منتج ہوتا ہے مثلاً قوت حافظہ وغیرہ) فانی ہو تو گویا انسان کی شخصیت کا فنا لازم آئے گا۔ بہر حال ارسطو صریح و واضح لفظوں میں اس مسئلہ پر رائے زنی نہیں کرتا بلکہ اسکو اپنے شارحین کی جولانی طبع اور موشگافیوں کے لئے چھوڑتا گیا ہے۔

علم نفس کے متعلق ارسطو نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں اون سے معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو کی رائے میں علم سے مراد ایک طرح کی مشابہت ہے جو نفس ناطقہ انسانی اور شے میں پائی جاتی ہے (افلاطون کے نزدیک یہ مشابہت مطابقت کا حکم رکھتی تھی) نظر بران نفس ناطقہ انسانی کلیات کا ادراک کرتے وقت کسی ایسی شے کا ادراک کرتا ہے جو نوعیت میں خود اس کے ساتھ اشتراک رکھتی ہے یعنی مادی نہیں ہوتی بلکہ از قسم جوہر لطیف ہوتی ہے اس لحاظ سے ارسطو کی کلیات افلاطون کے مثالیات سے اقرب واشبہ ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ ارسطو کہتا ہے کہ کلیات عقلی مبدا ہر حالت میں نفس ناطقہ انسانی ہوتا ہے یہ کبھی ممکن نہیں کہ اون کا مصدر عالم مثال ہو یا وہ بطور خود موجود

محسوسات ومرئیات کے نقوش ابھرآتے ہیں۔ اور یہ کہ خود نفس ناطقہ انسانی میں ایک فطری استعداد اس طرح کی موجود ہے کہ ہماری معلومات (حضوری) کا ایک بہت بڑا حصہ خود بخود اوسی کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اس خیال کا ارسطو قایل نہ تھا کہ اس سادہ تختی پر محسوسات یعنی اشیاء خارجی کا عکس پڑا کرتا ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق کہ عالم حادث ہے یا قدیم موجودہ سائنس کی تعلیم یہ ہے کہ ایک زمانہ معینہ میں دنیا کی ابتدا ہوئی اور موالید ثلاثہ بتدریج نشو ونما پاکر اس حالت میں پہونچے جس میں ہم اون کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ خیال جس کا عنوان آج کل کی مشہور علمی اصطلاح قانون ارتقا ہے ارسطو کے مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ عالم ازلی وقدیم ہے اور قدرت کا طرز عمل ایک دفعہ معین ہوچکا ہے جس میں تبدیل وتغیر کی گنجایش نہیں ہاں اتفاقات وحوادث کی وجہ سے کبھی کبھی کوئی خفیف سا جزئی تغیر ہوجایا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ارسطو تمدن انسانی کے نشو ونما تدریجی کو مانتا ہے لیکن اپنے اس دعوے کے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کہ دنیا کی موجودہ حالت قدامت کا پہلو لئے ہوئے ہے وہ یہ عجیب وغریب دلیل پیش کرتا ہے کہ جب بنی نوع انسان تمدنی ومعاشرتی ترقی کے معراج پر پہونچ چکتے ہیں تو ایک بہت بڑا فطری انقلاب (مثلاً ایک طوفان یا زلزلہ یا وبا وغیرہ) برپا ہوتا ہے اور نسل انسانی کو بہ استثنائے معدودے چند افراد کے نیست ونابود کردیتا ہے جس کی وجہ سے اوس ترقی کے آثار بھی ملیامیٹ ہوجاتے ہیں جو انسان نے کی تھی۔ یہ چند افراد انسانی جو بچ رہتے ہیں نئے سرے سے تمدن کی بنیاد ڈالنی شروع کرتے ہیں اور جب پہلے کی طرح نسل انسان بڑھکر دنیا پر چھا جاتی ہے اور منتہاے ترقی پر پہونچ چکتی ہے تو پھر کوئی بلا نازل ہوکر اوس کو تباہ کرڈالتی ہے۔ اسی طرح یہ دور تسلسل قایم رہتا ہے۔

[illegible] بوعلی [illegible] کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے

کہ شہرستانی اوس کو سب کا سرتاج اور سب کے لئے واجب الاتباع خیال کرتا ہے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب تہافۃ الفلاسفہ میں جو حملے فلسفہ پر کئے ہیں وہ درحقیقت بوعلی پر ہی کئے ہیں۔

ذہنیات اور موجودات خارجی میں باوجود مشائی اور اشراقی توجیہات کے جو عقلی تناقض مدتوں سے چلا آتا تھا اوس کے رفع کرنے کی غرض سے حکما کے ایک گروہ نے جن میں اسکولسٹیسزم Scholasticism یعنی مسیحی علم کلام کا بانی کہا جا سکتا ہے تیسری صدی عیسوی میں فلسفہ کا ایک نیا مذہب فلسفہ اشراقیہ جدید کے نام سے اسکندریہ میں قایم کیا۔ اس مذہب کا مقصد یہ تھا کہ عقل اور ایمان میں توافق پیدا کیا جائے ہستی علی الاطلاق یعنی خدا کی ذات کا تعقل چونکہ افلاطون کے کلیات عقلی کی وساطت سے ہونا محال تھا لہذا فلسفۂ اشراقیہ جدید کے بانیوں نے مکاشفہ کے مسئلہ کو رواج دیا۔ اس مسئلہ کا مفہوم یہ ہے کہ ادراک کے اجزائے عاقدہ و منعقدہ یعنی نفس ناطقہ و شئے مدرکہ باہم مخلوط و منضم ہو کر ایک ہو جائیں اور اون میں کوئی فرق نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تاویل یوں کی جا سکتی ہے کہ انسان کی تمنا ہے کہ اوس کو علم مطلق حاصل ہو لیکن اس حصول کے لئے خارجی اشیا کا ادراک یا طریقہ استعمال بیکار ہے۔ علم مطلق اوس کو اوسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ انجلائے نفس اور تزکیۂ باطن سے محسوسات اور موجودات خارجی کو اپنا پرتو بنالے اور بیرونی اثرات سے یہاں تک مستغنی ہو جائے کہ عالم اور معلوم ایک ہو جائیں اور اس طور پر سب چیزوں کا ادراک مکاشفہ یا بصیرت سے ہو جائے کثرت کے تصور سے جو عقلی مشکلات فلاسفہ کو اکثر پیش آئی ہیں اون سے

بچنے کے لئے فلسفہ اشراقیہ جدید کے [illegible]

سے ماخوذ اور اوسکے مظاہر ہیں ۔

جب اسلام فلسفہ یونان کے ساتھ ٹکرایا اور علم کلام کو متعلق تاریخ کو اپنے تئیں دھرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو مسلمانوں میں ایک گروہ علماء متکلمین کا ایسا پیدا ہو گیا جنہوں نے مذہب اور فلسفہ کی تطبیق میں کوئی دقیقہ اوٹھا نہ رکھا۔ بوعلی سینا نے علم کلام میں اگرچہ اگر خاص طور پر علم امتیاز بلند نہیں کیا لیکن اسلام کے اصولی مسائل مثلاً توحید و نبوت وغیرہ کے متعلق اوس نے جو بحث کی ہے اوس کے لحاظ سے بیجا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ علم کلام کو اوس کا مشکور ہونا چاہیئے۔ بوعلی نے اسلام اور فلسفہ میں تطابق پیدا کرنے کی غرض سے مشائی اصول کی تشریح کے ساتھ فلسفۂ اشراقیہ کا طرز عمل اختیار کیا اور اوس کی شرح جدت کا جو پہلو لئے ہوئے ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔

یہ مسئلہ کہ انسان کو اشیا کا ادراک کس طریقہ پر ہوتا ہے بوعلی سینا نے نہایت ہی دلچسپ طور پر بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نفس ناطقۂ انسانی کے دو رخ ہیں ایک رخ جسم کے مقابل ہے اور اپنے حصۂ علوی کی تائید سے سوچ سمجھ کا معمولی کام انجام دیتا ہے۔ دوسرا رخ تصورات عقلی کا دریچہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کائنات کا تماشا گاہ ادراکی بن کر جزئیات و کلیات کو ترتیب دیا۔ اور اون پر حاوی ہوا کرے انسان میں صرف تعقل کی استعداد پائی جاتی ہے اور جو چیز کہ اوس استعداد کو سہارا دیتی ہوئے ہے وہ عقل فاعلہ ہے۔ جب انسان اون رکاوٹوں کو جو عقل اور نفس ناطقہ کے اختلاط کی راہ میں حائل ہیں دور کر دیتا ہے تو عقل کی روشنی اوس میں سرایت کرنے لگتی ہے۔ اس انجلا یا تلمیع کے بوعلی سینا نے چار مدارج قرار دئے ہیں۔ پہلا درجہ

سکتے ہیں۔ اس حالت کا مقابلہ بچہ کی اوس حالت سے کیا جا سکتا ہے جبکہ اوس
ابجد نویسی کے مبادی سیکھ لئے ہوں اور محض اس امر کا امکان پایا جاتا ہو کہ رفتہ رفتہ
نشو و نما پاکر وہ فن تحریر میں مہارت تامہ حاصل کرے گا۔ تعقل کے تیسرے درجہ کا
نام حقیقی ہے جس کو بچہ کی اوس حالت سے تشبیہ دے سکتے ہیں جب وہ لکھنے پر
قادر ہو جاتا ہے اس تیسرے درجہ میں عقل اکتشاف و استنباط کے کوچہ میں اوّل
اوّل قدم رکھتی ہے۔ اس کے بعد جب نشو و نما یافتہ بچہ میں لکھنے کی قابلیت
بطور مستقل پیدا ہو جاتی ہے یعنی جب اوس کو یہ قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ جس
واقعہ کو جس وقت چاہے قلمبند کرلے تو اس حالت کا مقابلہ تعقل کے چوتھے درجہ
سے کیا جا سکتا ہے جسے عملی کہتے ہیں۔ یہ وہ درجہ ہے جس میں معارف پر پورا عبور
ہو جاتا ہے اور ادراک کے اس طریقہ کو اگر استعارہ میں ظاہر کیا جائے تو یہ کہہ سکتے
ہیں کہ انسان کو تعقل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کوئی جسم متنیر بتدریج روشن ہو۔
اس کے بعد بوعلی سینا کہتا ہے کہ اگرچہ اکتساب معارف کی یہ استعداد ہر ایک
انسان میں پائی جاتی ہے اور کوئی شخص ایسا نہیں جو عقل فاعلہ سے متاثر نہ ہو لیکن
اس کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں بعض شخص عقل فاعلہ (یعنی الٰہیات کی اصطلاع
میں خدا اور ملائکہ) سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں بعض کم۔ بالفاظ دیگر بعض باعتبار تعلق
عقل فاعلہ سے قریب ہوتے ہیں اور بعض بعید بعض صورتوں میں استعداد اکتساب
اس درجہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ انسان حصول علم کے بغیر ہی دفعۃً ایک پاک
قوت کی تائید سے حقیقت کا درس حاصل کرلیتا ہے گویا کہ ایک جست میں وہ

... ہیں کو وجود ذات باری بذاتہ واجب ہے چونکہ واجب ہونے کی صفت

علۃ العلل یعنی خالق ہی کا خاصہ ہے اور مخلوق کو اس صفت سے متصف کرنا ایک ایسی ہستی

کا ماننا ہے جو اس لحاظ سے خالق علی الاطلاق کی سہیم و شریک ہو لہذا بو علی نے اس کی

توجیہ اس طرح کی ہے :- اُس میں شک نہیں کہ خدا کے سوا باقی تمام چیزیں اپنی نوعیت

کے لحاظ سے ممکن ہیں لیکن علت اولین کے تخلیقی فعل سے بعض اشیا قابل لزوم یعنی

واجب ہو جاتی ہیں" بہ الفاظ دیگر ممکن بدل کر واجب ہو سکتا ہے +

نبوت۔ خرق عادت۔ تائید ایزدی یعنی انسان کے کاروبار میں خدا کی مداخلت۔ اور

بقائے روح وغیرہ مسایل کو بو علی سینا نے عقلی دلایل سے ثابت کرنے کوشش کی ہے۔

انفرادی حیثیت سے روح انسانی کے باقی اور غیر فانی ہونے کا ثبوت اوس نے ان

دلایل سے دیا ہے جن سے افلاطون کام لیتا ہے۔ معجزات اور خارق عادت واقعات

پر اوس کا اعتقاد ایسا ہی ہے جیسا ہندسہ کی اس شکل پر کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ فلسفہ میں شغف رکھنے کی وجہ سے فوق العادت امور کو وہ

ابتداءً تشکک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن اُس کے زمانہ کے صوفیا نے علم حضوری کے

بعض بعض کرشمے اس کو ایسے دکھائے کہ اوسکا تشکک بالکل جاتا رہا چنانچہ اُس کا

قول ہے کہ اگر علمائے متصوفین میں سے کسی کو پانی پر پتھر کی سل تیراتے یا خشک ٹہنی کو

طرفۃ العین میں ہرا کرنے یا اسی قسم کا کوئی فوق العادت کرشمہ دکھانے کا دعویٰ ہو تو

میں یقین مان لوں گا کہ یہ دعویٰ سچ ہے +

آج ہم درس اشارات و شفا کہنے کو ہیں

وجود کا مستلزم ہے البتہ فرق یہ ہے کہ معمولی حوادث کی علتیں عام لوگوں کو معلوم ہوتی ہیں اور خرق عادات کی علتوں کا دریافت کرنا فلاسفہ و متصوفین کا کام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خرق عادات کبھی عناصر کے قوی کے امتزاج سے صادر ہوتے ہیں کبھی کواکب کی تاثیرات سے اور کبھی قوائے نفسانیہ کی بدولت۔ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب تاریخ علم کلام میں بوعلی سینا کے اس مسئلہ کی توضیح کی ہے اور ہم اُن کی پوری عبارت یہاں نقل کرتے ہیں۔

"بوعلی سینا نے اشارات میں خاص اس بحث پر ایک عنوان قایم کیا ہے۔ اور اس میں لکھا ہے کہ اگر تم سے کوئی شخص کہے کہ کسی درویش نے مدت تک کھانا نہیں کھایا یا کوئی ایسا کام کیا جو اس کی قوت سے زیادہ تھا یا کوئی پیشین گوئی کی یا اس کی بددعا کی وجہ سے کوئی شخص زمین میں دھنس گیا یا زلزلہ آگیا یا درندہ مسخر ہو گیا وغیرہ وغیرہ تو تم اُس سے انکار نہ کرو کیونکہ ان سب کے اسباب طبعی ہو سکتے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے انکا ظہور ہوتا ہے۔ بوعلی سینا نے ان اسباب طبعی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثلاً امساک طعام کی نسبت لکھا ہے کہ معدہ جب مواد ردیہ کے ہضم کرنے میں مصروف ہوتا ہے تو صحیح غذا پر کم عمل کرتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دن تک انسان کو بھوک نہیں لگتی کیونکہ بدل ما تحلل کی ضرورت نہیں پڑتی اس بنا پر ممکن ہے کہ کسی صاحب حال کو خدا کے تصور میں اس قدر استغراق اور محویت ہو کہ طبیعت غذا کے ہضم کی طرف نہ مایل ہو۔ اس حالت میں مدت تک وہی غذا قایم رہے گی اور بدل ما تحلل کی ضرورت نہ پڑے گی۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ خوف کی حالت میں بھوک بالکل جاتی رہتی ہے۔"

بوعلی سینا نے گو ان تمام خرق عادات کے وجوہ اور اسباب بیان کئے تاہم ان کا نام خرق عادات ہی رکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو چیز عام عادت کے خلاف

[illegible] جاتی ہے تو واقع ہیں وہ اصول قدرت کے خلاف نہیں ہوتی اشارات میں خود اُس کے الفاظ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے وہ خرق عادات کے بیان میں لکھتا ہے ولکنہا تجارب لما ثبت طلب اسبابہا ثم انی لو قصصت جزئیات ھذا الباب فیما شاھدناہ وفیما حکی عن صدقنا لطال الکلام (لیکن یہ تجربے ہیں اور جب وہ ثابت ہوئے تو اُن کے اسباب کی جستجو ہوئی اور اگر میں اس قسم کے جزئیات کا شمار کروں جو میں نے دیکھے یا اون لوگوں نے دیکھے جن کو میں ثقہ سمجھتا ہوں تو بہت طول ہو جائے گا۔

بوعلی نے مختلف خرق عادات کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔ ان میں سے اس نے سب سے بڑا سبب قوت نفسانی کا اثر قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل اس کے بیان کے موافق حسب ذیل ہے۔ یہ امر بداہۃً ثابت ہے کہ تخیل اور توہم کا اثر جسم پر پڑتا ہے مثلاً خوشی سے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ بعض دفعہ محض وہم سے آدمی بیمار ہو جاتا ہے بیٹھے بیٹھے انسان کو کسی کی طرف سے دل میں ناگوار خیالات آتے ہیں۔ ان خیالات سے غصہ پیدا ہوتا ہے غصہ سے حرارت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ پسینہ آجاتا ہے اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ مادیین کا یہ دعوے صحیح نہیں کہ مادہ پر صرف مادہ ہی اثر ڈال سکتا ہے۔ خیال و وہم غیظ و غضب۔ مادہ نہیں بلکہ ایک کیفیت ہے باوجود اس کے ان کا اثر جسم پر پڑتا ہے۔ جس طرح ان کیفیات سے انسان خود متاثر ہوتا ہے۔ بعض انسانوں میں یہ قوت اس قدر قوی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ یہ قوت انسانوں میں علی قدر مراتب قوی اور ضعیف ہوتی ہے اور بعض انسانوں میں اس قدر قوی ہوتی ہے کہ اوس سے [illegible]

طبیعت اور شریر ہوتا ہے اور اس قوت کو برے کاموں میں صرف کرتا ہے تو وہ جادو گر اور شعبدہ گر ہوتا ہے"۔

نبوت کے متعلق بوعلی سینا نے جو بحث کی ہے وہ نہایت ہی دلچسپ ہے وہ کہتا ہے کہ اگر خدا کو اس حیثیت سے مانا جائے کہ وہ مبداء خیر ہے تو نبی کا ماننا لازم آتا ہے اوس کے نزدیک بنی نوع انسان کی بقا اور اُن کی بہبودی کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے اول یہ کہ انسان کو حق و خیر کی تمیز اور پورا پورا علم ہو دوسرے یہ کہ کوئی طاقت جس کو قانون اخلاقی کے ان حقایق کا انکشاف ہو سکے ایسی موجود ہو جس سے انسان مدد لے سکے اگر عالم الغیب و الشہادۃ نے آنکھ کی بصارت کی حفاظت پلکوں اور بھووں سے کی ہے تو اس بات کی بدرجہ اولی ضرورت ہے کہ اوس کی قدرت کاملہ سے ایک نبی مبعوث ہو جو وحدت ذات باری تعالے کی تلقین کرے۔ انسان کے لئے اخلاقی قواعد بنائے اور ثواب وجزا کی بشارت دے کر اُسے صراط مستقیم پر چلنے کی فہمایش کرے۔ نبوت کی حقیقت کے تسلیم کرنے کے لئے معجزات کا ظہور ضروری ہے شفا میں اثبات نبوت کے عنوان سے جو فصل بوعلی سینا نے درج کی ہے اُس میں نبی کے متعلق وہ لکھتا ہے فیکون له المعجزات التی اخبرنا بها اس کا خیال ہے کہ جس طرح معمولی حالتوں میں نفس ناطقہ انسانی یا روح بدن کے اعضا و جوارح پر اپنا اثر ڈالتی ہے اسی طرح غیر معمولی حالتوں میں جب اس کا نفس ناطقہ انسانی کا) گذر مقامات عالیہ میں ہوتا ہے تو وہ اُن عقول مجرد عن المادہ کی ہم رتبہ ہو جاتی ہے جو اپنی قوت فاعلی کے استعداد کی بدولت کائنات کے تمام مظاہر انفعالی میں نافذ و ساری ہو سکتی ہیں کائنات غیر مرئی کے ساتھ نبی کے قوا ے

ہو جاتی ہیں۔ کیا تاریک اندھیرے میں بجلی کے کوندنے سے دفعتہ اس پاس کی سبھی چیزیں
جگمگا اٹھتی ہیں۔ اسی عالم میں صاحب قوت قدسیہ کی عقل اپنا پر تو معمولی روح پر یعنی وجود کے
اس مظہر پر ڈالتی ہے جس کا کام جزئیات اور کلیات کا معمولی طور پر ادراک کرنا ہے
اس وقت نبی کو ملائکہ مجسم صورت میں نظر آتے ہیں اور وہ ان کی خوش الحان آوازیں
بھی سنتا ہے ؛

ارسطو کے مذہب کی رو سے عالم قدیم و ازلی تھا۔ بو علی سینا بھی قدم عالم کا قایل
ہے لیکن اسلام کی تعلیم نے ذات باری تعالی کی صفات کے متعلق جو خیالات اوس
کے ذہن نشین کئے تھے اون کے لحاظ سے ممکن نہ تھا کہ وہ عالم کو انہیں معنوں
میں قدیم و ازلی سمجھے جن معنوں میں ذات باری تعالی قدیم و ازلی ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا
سمجھتا تو عالم اور خدا دو برابر کی ہستیاں سمجھی جاتیں جو ایک دوسرے کی شریک و
سہیم ہوتیں۔ حالانکہ خدا علت العلل اور اس لحاظ سے تکوین عالم کی علت ہے۔ اس
بنا پر بو علی سینا عالم کے قدم سے قدم بالذات مراد نہیں لیتا بلکہ اس کو قدم بالغیر
سمجھتا ہے قدم بالذات صرف خدا کی صفت ہو سکتی ہے جو واجب الوجود ہے۔ بالفاظ
دیگر خدا اور عالم دونوں قدیم و ازلی ہیں خدا بہ حیثیت علت ہونے کے اور عالم من
حیث معلول ہونے کے اس پر گو بظاہر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ کہ جب ایک
علت ہے اور دوسرا معلول تو دونوں قدیم کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اشتراک
قدم کے لئے اشتراک زمانی ضروری ہے حالانکہ علت ہمیشہ مقدم ہوا کرتی ہے
اور معلول موخر۔ لیکن تھوڑے سے غور سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ اعتراض حرف لفظی
ہے۔ ورنہ اصلیت اس کی کچھ نہیں۔ علت اور معلول در اصل ایک معینہ حادثہ یا

تو دوسرا امتحانا اس کے ساتھ ہی موجود ہوتا ہے۔ زید کتب پیچھے لکھتا ہے تو لکھنا ایک واقعہ

ہے جو دو ارکان سے مرکب ہے۔ قلم کا جنبش میں آنا اور کاغذ پر تحریر کا نمودار ہونا۔
جن میں سے اول الذکر علت ہے اور ثانی الذکر معلول لیکن اگر کوئی یہ کہے۔ کہ
ترتیب زمانی کے اعتبار سے قلم کا جنبش میں آنا مقدم ہے اور تحریر کا کاغذ پر نمودار
ہونا موخر تو یہ اُس کا خیال ہی خیال ہے۔ قلم جس وقت جنبش میں آتا ہے اسی وقت
تحریر بھی کاغذ پر نمودار ہو جاتی ہے اسی استدلال کو مدنظر رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ
خدا اور عالم باوجود علت و معلول ہونے کے قدیم و ازلی ہیں۔ حدوث عالم کی نفی
بو علی سینا نے فارابی کی طرح اس دلیل سے کی کہ جملہ حوادث کا مصدر حرکت فلکیہ ہے
اور چونکہ حرکت فلکیہ عقل اولین کا نتیجہ ہے اور عقل اولین علۃ العلل یعنی واجب الوجود
کے ساتھ قدیم (قدیم بالذات نہیں بلکہ قدیم بالغیر) ہے لہذا جو اشیا اُس سے صادر
ہونگی وہ بھی قدیم ہونگی ÷

قدم و ازل کی بحث کے بعد بو علی سینا نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چونکہ ذات واجب الوجود
سب جہات سے واجب الوجود اور تمام اشیا کی علت ہے لہذا وہ معلول کو بھی واجب
کر دیگی اور جب یہ علت خود ہمیشہ باقی ہے تو معلول بھی دائمی طور پر معلول رہے گا۔ اصل
عبارت بو علی سینا کی اس مسئلہ کے متعلق شفا میں حسب ذیل ہے ولقد بان
لک ان واجب الوجود بذاتہ واجب الوجود من جمیع جہاتہ فانہ لا یجوز ان
یستانف لہ حالۃ لم تکن معہ انہ قد بان لک ان العلۃ لذاتہا یکون موجبۃ
المعلول فان دامت اوجبت المعلول دایما ÷

بو علی سینا کے خیال کے مطابق ممکن اور واجب کے تصور سے ایک ہستی واجب الوجود
کا موجود ہونا صاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خالق کے وجود کا ثبوت اس کی مخلوقات

سب کا وجود ایک اور ذات کے وجود کی بدولت واجب ہو جاتا ہے جو فوق الامکان ہے اور اس لحاظ سے کثرت و تبدیل سے بالا ہے ؎

ذات باری تعالےٰ کے تصور میں بلحاظ اُن صفات کے تنوع اور تناقض کے جو خدا سے منسوب کی جاتی ہیں اور باعتبار مخلوقات کے گوناگون ہونے کے جو مشکلات فلاسفہ کو پیش آئی ہیں اور ان مشکلات کو جن مسایل کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے اُن میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ

الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد

یعنی جو شے بالذات واحد ہو اس سے اگر کوئی شے صادر ہوگی تو وہ واحد ہی ہوگی بو علی سینا کو بھی اس اصول کا قائل ہونا پڑا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ جو ذات واجب مطلق ہو وہ واحد مطلق ہوتی ہے جس سے کثیر اشیا کا صادر ہونا محال ہے۔ یہ واجب اور واحد مطلق ذات خدا ہے اور اگرچہ ہم کو بعض صفات مثلاً تعقل وغیرہ اس سے منسوب کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن یہ صفات محض سلبی یا اعتباری حیثیت رکھتی ہیں اور اس کی وحدت پر اثر نہیں ڈالتیں یہ ذات واحد صرف ایک ہستی کا مبدا ہو سکتی تھی یعنی عقل اولین کا عقل اولین نے پیدا ہو کر کثرت کی بنا ڈالی یعنی اس سے ایک اور عقل پیدا ہوئی اس سے ایک اور یہانتک کہ عقل فعال کا ظہور ہوا جس نے تمام مادی اجسام و اشکال و ارواح کو واسطہ در واسطہ پیدا کیا بہر حال خدا کے متعلق بو علی سینا کا جو خیال تھا اُسے اس نے ذیل کی جان اور معنی خیز عبارت میں شفا کے نویں مقالہ میں بیان کیا ہے

فقد ظهر لنا ان للكل مبدأ واجب الوجود غير داخل في جنس او واقع تحت
حد او برهان بری عن الکم والکیف والماهیة والاین والمتی والحرکة

لیکن مابعد الطبیعیات کے متعلق ارسطو و افلاطون نے اگر اس قسم کے خیالات قایم کیے ہوں اور بوعلی سینا فارابی وغیرہم نے ان کو فروغ دیا ہو تو کچھ مقام تعجب نہیں۔ ابن تیمیہ و امام غزالی نے اسی زمانہ میں اس قسم کے خیالات پر جرح کرکے ان کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور ان لوگوں کو اس میں کامیابی ہوئی بھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن امور کی تحقیق کے لیے ہمارے پاس واقعات و اعداد نہ ہوں اور محض تخیل پر مدار ہو ان میں سوائے اسی قسم کے مسایل کے ہم اور کونسی انوکھی بات پیدا کر سکتے ہیں ؛

خیر و شر کے متعلق بوعلی سینا کا خیال ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں البتہ خیر کا وجود خدا کی خوشنودی اور صوابدید کا موجب ہے۔ شر اول تو حقیقی طور پر موجود ہی نہیں اور اگر منجاب اللہ ہونے کے لحاظ سے موجود ہے بھی تو محض ایک شئے اعتباری ہے جو شرور دنیا سے لازمی طور پر وابستہ ہیں اُن سے دنیا کو بچانے کے لیے اگر خدا اونہیں پیدا نکرتا تو خود اس عدم تخلیق کی وجہ سے ایک بہت بڑا شر ظہور میں آتا کیونکہ عالم میں جس قدر نیکی اور خوبصورتی بحالت موجودہ نظر آتی ہے اوس سے زیادہ ہونی ممکن نہ تھی نظام عالم میں جو ترتیب اور خوش اسلوبی ہم کو نظر آ رہی ہے وہ تایید غیبی ہے جو عقول فلکیہ کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے۔ خدا اور صور علمیہ (ملائکہ) صرف کلیات کا ادراک کرتے ہیں۔ مدرک جزئیات ہونے کی قابلیت نہیں رکھتے البتہ عقول فلکیہ جن کے تفویض مفردات کی وکالت ہے اور جن کی مدد سے روح جسم پر عمل کرتی ہے وہ ہستیاں ہیں جن کی وساطت سے یہ امر ممکن ہو جاتا ہے کہ خدا فرداً فرداً اشیا و اشخاص کی نگہداشت و خبرگیری کرے اور مصدر الہام و تنزیل بنے وقس علی ہذا ؛

ایک جوہر مستعد ہو کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ جو چیز علت یا سبب ہونے کی استعداد رکھتی ہے وہ ہر صورت میں یا تو کوئی طاقت ہوتی ہے یا صورت علمیہ یا روح۔ بنا بران عالم طبعی میں بیشمار طاقتیں ہیں جنہیں اگر نیچے اوپر علیٰ قدر مدارج رکھا جائے تو طبقہ سافل سے طبقہ عالی کی طرف جاتے وقت ان میں سے حسب ذیل زیادہ نمایاں اور ممتاز نظر آئیں گی :- قدرت کی قوتیں نباتات اور حیوانات کی نامیہ طاقتیں نفوس ناطقہ انسانی۔ نفوس قدسیہ۔

روح انسانی یعنی نفس ناطقہ کی تعریف ارسطو نے یہ کی ہے کہ مدرک کلیات و جزئیات ہے۔ بو علی سینا نے زیادہ موشگافی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ طبیعات شفا میں لکھتا ہے "وبالجملۃ کل ما یکون مبدأ لصدور افاعیل لیست علی وتیرۃ واحدۃ عادمۃ للارادۃ فانا نسمیہ نفسا" یعنی نفس اوس قوت کا نام ہے جو ان افعال کے صدور کا مبدا ہو جو ایک وتیرہ پر نہ ہو جن سے ارادہ کا انعدام ہو جائے۔ اسی تعریف کے بموجب ادراک اشیا کی بھی علی سینا کے مذہب میں تین حالتیں ہیں۔ اشیاء مادی کا ادراک حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اشیاء غیر مادیہ جزئیہ کا نفس کے ذریعہ سے اور اشیاء غیر مادیہ کلیہ کا عقل کے ذریعہ سے۔

فطرت انسانی کے متعلق بو علی سینا کا خیال ثنوی پہلو لئے ہوئے ہے اس کی رائے میں جسم اور روح کا باہمی تعلق حقیقی و لازمی نہیں۔ کل اجسام عناصر کی آمیزش سے کواکب کی تاثیرات کی بدولت پیدا ہوتے ہیں اور بدن انسانی کے معرض شہود میں آنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ البتہ اس کے لئے آمیزش کے وقت عناصر میں

یہ طریقہ تو نہ لیکن روح کی توجیہ آمیزش عناصر سے نہیں کی جا سکتی۔ روح کی اصل یہ سمجھنا چاہئے جو جسم کا جزو لاینفک ہے بلکہ جسم کو جوہر سمجھ کر اسے عرض سے تعبیر کرنا چاہئے۔ معبود مطلق یعنی اس عقل فعال کو جو ہم پر مسلط ہے مبداء فیاض سمجھنا چاہئے۔ یہاں سے ہر جسم کو ایک روح ملتی ہے اور یہ روح اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اسی جسم کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ ابتدا ہی سے ہر روح میں بعض ذاتی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور جب تک وہ جسم کے اندر رہتی ہے یہ خصوصیات نشو و نما پاتی رہتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خیال اس دعوے کے ساتھ توافق نہیں رکھتا کہ مادہ ذات کا جزو اصلی ہے لیکن بو علی سینا روح کو عجائبات قدرت کا مظہر سمجھتا ہے۔ با ایں ہمہ اس کی طباعی اور فطانت اوسے یہ اجازت نہیں دیتی کہ اسرار حیات کے قفل کی کلید روح ہی کو مان لے۔ جہاں اس نے عدم و وجود کی پیچ در پیچ راہوں سے روح کے گذرنے اور حیات کی بھول بھلیاں میں اس کے بھٹکتے پھرنے کا ذکر کرتے وقت ان حیرت انگیز اور کثیر التعداد طاقتوں اور اثروں کا ذکر کیا ہے جو روح میں ودیعت کی گئی ہیں وہاں بارہا یہ بھی کہا ہے کہ ان پہیلیوں کے بوجھنے میں جلد بازی سے کام نہ لینا چاہئے۔

بو علی سینا کے خیال کے مطابق ملکات نظری قوائے روحانی کا گل سرسبد ہیں۔ عالم مادی کا تعلق روح مدرک کو حواس خارجی و باطنی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ بو علی نے حواس باطنی کے متعلق اپنی رائے نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کی ہے۔ حواس باطنی سے تخیل و اظہار کے وہ قوائے حسی و ذہنی مراد ہیں جن کا مستقر دماغ ہے۔

ان فلاسفہ نے جو طب میں بھی دخل رکھتے تھے عام طور پر تین حواس باطنی یعنی مدارج عمل خیال قرار دئے تھے
... مختلف محسوسات یکجا جمع ہو کر ایک صورت

...تب پھر ادراک بالنفس کے درجہ کو پہونچا۔

(۳) دماغ کے پچھلے حصہ میں ان صور مدرکہ کا حافظہ کے اندر جمع ہونا۔ بوعلی سینا نے حواس باطنی کے تجزیہ میں زیادہ موشگافی سے کام لیا ہے اس کے نزدیک دماغ کے سامنے والے حصہ میں دو جداگانہ قوتیں موجود ہیں۔ جو ایک دوسری سے الگ الگ ہیں۔ ایک تو محسوسات کی یاد جسے مجموعی صورتوں کے خزانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور ایک حس مشترک۔ اس کے بعد بوعلی کہتا ہے کہ ادراک بالنفس جو دماغ کے درمیانی حصہ کے عمل کا نتیجہ ہے ایک حد تک حسی و شہودی زندگی کے اثرات کے باعث بےخبری کے عالم میں بر سبیل اضطرار مترتب ہوتا ہے چنانچہ یہ حالت حیوانات درجہ سافل میں پائی جاتی ہے اور ایک حد تک اختیاری طور پر ہشیاری کے عالم میں عقل کی تائید سے منتج ہوتا ہے۔ حالت اولیٰ میں عمل خیال شے منفرد سے تعلق رکھتا ہے مثلاً بھیڑ جانتی ہے کہ بھیڑیے کو اس سے دشمنی ہے اور حالت ثانی میں کلیات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ بالآخر دماغ کے پچھلے حصہ میں ایک پانچویں طاقت رکھی گئی ہے جسے حافظہ مدرکات یعنی اُن صورتوں کا خزانہ کہہ سکتے ہیں جو تاثر حسی اور تخیل عقلی کے متفقہ عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طور پر بوعلی سینا کے نزدیک حواس خمسہ ظاہری کے مقابل میں حواس خمسہ باطنی موجود ہیں یعنی (۱) حس مشترک (۲) صور محسوسہ مجموعی کی یاد (۳) ادراک اضطراری متعلق بافراد (۴) ادراک اختیاری بالتعمیم (۵) مدرکات عالیہ کی یاد۔

ملکات فطری کو اگر ایک مثلث سے تشبیہ دی جائے تو عقل اس کا زاویہ راس ہوگی عقل کی وحدت و تجرید کا ثبوت ادراک ذات یعنی ماہیت نفس کی شناخت مطلق سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ قیاس نہ کرنا چاہئے کہ عقل روح کے قوائے

علو پر پہونچا کر محسوسات کے ادراک میں لطافت اور

کی شان پیدا کرتی ہے اول اول عقل استعداد تخیل پر مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن اُن وسائط کی تائید سے جو حواس ظاہری و باطنی اس کے سامنے پیش کرتی ہیں بہ تدریج ترقی کر کے قوت انتقال ذہنی میں کمال بہم پہونچا لیتی ہے بہ الفاظ دیگر ممارست و مزاولت سے استعداد مبدل بہ حقیقت ہو جاتی ہے۔ عقل کو یہ درجہ تجربہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس تجربہ پر اس مصور مطلق کی شمع ہدایت کا تو پڑنا ضرور ہے جو نفس فعال ہونے کی حیثیت سے ہمارا ہادی و رہبر ہے اور پردہ عقل پر خیالات کے نقوش منتقش کرتا رہتا ہے۔ لیکن عقل کے خیالات بسیط یا مجرد عن المادہ روح یعنی نفس ناطقہ انسانی کے حافظہ سے بالا ہیں۔ کیونکہ حافظہ کے ساتھ کسی مادی شے کے تخیل کا لزوم وابستہ ہے پس جب کبھی نفس ناطقہ انسانی کو کسی شے کا علم ہوتا ہے تو اُسے بالالتزام عالم غیب (عقل فعال) سے استعلام کرنا پڑتا ہے اور نفوس ناطقہ انسانی کے حیز معلومات کا قیاس وہ استعداد ہے جو بغرض حصول علم عقل فعال سے روابط قایم کرنے کے متعلق کم و بیش ہر نفس میں ودیعت کی گئی ہے اس سے واضح ہو گا کہ نفس عقلی جو ملکات تحتانی پر حکومت کرتا ہے اور جسے مدارک کلیہ عالیہ کا ادراک بذریعہ الہام ہوتا ہے حقیقی نفس ناطقہ ہے جو ایک جوہر غیر مخلوط کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور منفرد و ناقابل زوال اور غیر فانی ہے۔ اس مسئلہ کی تشریح میں بو علی سینا وضاحت و صراحت کے لحاظ سے فارابی پر سبقت لے گیا ہے اور اس کے زمانہ سے معرض شہود میں آئے ہوئے نفوس انسانی کے بقائے انفرادی کا مسئلہ مذہب مشائیہ کا ایک جزو سمجھا جانے لگا ہے۔ بخلاف اس کے یہ دعوے کہ روح انسانی منفردانہ حیثیت سے باقی و غیر فانی نہیں اشراقین سے منسوب

پر جو اس جسم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتی ہے روح انسانی بدستور قایم رہتی ہے اور اس نفس مطلق سے جو تمام کائنات کا فرمانروا اور اس لحاظ سے گویا نفس عالم ہے کم یا زیادہ واسطہ رکھتی ہے۔ اسی تعلق پر جسے انضمام کامل نہ سمجھنا چاہیے نفوس مطمئنہ یعنی پاک۔ نیک اور ذی معرفت روحوں کی سعادت مشتمل ہے۔ باقی ارواح کے مقدر میں عذاب ابدی لکھا ہے۔ کیونکہ جس طرح بدنی قوانین کی خلاف ورزی بدن کو امراض کی سزا کا مستوجب قرار دیتی ہے اسی طرح روحانی شقاوت کا بھی لازمی نتیجہ عذاب ہے۔ اسی طرح جزاے اخروی بھی علی السبیل مدارج اس اخلاقی یا ادراکی علم کے لحاظ سے دی جاتی ہے جو روح دنیوی زندگی میں حاصل کرتی ہے ؎

فَمَن یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ خَیرًا یَرَہٗ ۝ وَمَن یَعمَل مِثقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَرَہٗ

سعید روحیں گو نوایب دہر میں مبتلا ہوں لیکن اس خیال سے اُن کی تشفی ہوتی رہتی ہے کہ آخر میں نعمت ابدی انہیں میسر ہو گی ؎

ازمنہ وسطے میں بوعلی سینا کا درجہ فلسفہ میں وہ نہیں تھا جو طب میں تھا۔ پھر بھی البرٹس میگنس[5] اور زمانہ مابعد کے علما نے منطق میں اُس کے مسایل سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ منطق میں بوعلی سینا صورت محض اور تصدیق میں امتیاز کرتا ہے اور ان اصولی ارکان کی بنا پر علم کا ایک مکمل نظام تعریف اور قیاس کے دو عملوں کے ذریعہ سے قایم کرتا ہے لیکن منطق کی تاریخ میں بوعلی سینا کے مذہب کو اگر وقیع واہم سمجھا جا سکتا ہے تو صرف اس حد تک سمجھا جا سکتا ہے جس حد تک اس کو ان خیالات یا نظریات کی نوعیت یا منصب سے تعلق ہے جو موجودات کی کیفیت

کہ کلیات اور جزئیات میں محسوسات کے ساتھ تعلق رکھنے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں ایک طرح سے وجود عقلی رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے جوہر کلی یعنی ذات باری کو من حیث مجرد عن المادہ ہونے کے کلیات سے (باعتبار اس تعلق کے جو کلیات کو افراد متعددہ سے ہے) جدا کر دیا تھا۔ بوعلی سینا کا مذہب انہیں اشارات پر مبنی ہے ؀

تصورات یا اشکال عقلیہ کو جن پر معلومات حقیقی مشتمل ہیں تین پہلوؤں سے دیکھا جاسکتا ہے اول معنوی یا امکانی طور پر (یعنی بہ طریقہ مابعد الطبیعیات) دوم محسوسات کی شکل میں (طبیعی طور پر) سوم خیال کے طریقہ عمل کی شکل میں (از روئے منطق) شیخ اول کو تصور کے وجود اصلی و مطلق سے بحث ہے اس کے علاوہ تصور پر من حیث اس مشابہت یا مماثلت کے نظر ڈالی جاسکتی ہے جو دو چیزوں کے باہمی مقابلہ سے بذریعہ تخیل ذہنی پیدا ہوتی ہے۔ اس طور پر تصور کو اعتباری یا دوسری شے کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے والا کہہ سکتے ہیں۔ جب اس حیثیت سے اس پر نظر ڈال کر اس کو ان مشترک کیفیات کا مظہر سمجھا جاتا ہے جو انفرادی مثالوں کے باہمی مقابلہ سے حاصل ہوتی ہیں تو اس کو کلیہ سے تعبیر کرتے ہیں تصور مطلق کو صحیح کلیہ کی شان اول اول عقل بسیط ہی عطا کرتی ہے جب تصور پر حیات یعنی اشیائے خارجی کا پرتو ہونے کی حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ اشیائے طبعی کے افراد کا کم و بیش نمونہ یا مثال ہو جاتا ہے۔ اسما کا مقصد اولی انہیں اشیائے خارجی کی تعبیر ہے۔ رفتہ رفتہ جب تخیل میں وسعت پیدا

---

۴ میں پیرس چلا آیا اور باوجود کلیسا کی ممانعت کے ارسطو کے فلسفہ کی شرح کرتا رہا۔ فلسفہ مشائیہ پر جو حواشی اوس نے لکھے وہ ۲۱ ضخیم جلدوں میں ہم تک پہنچے ہیں علم کیمیا و میخانیک میں اوسے اوس زمانہ کے لحاظ سے حیرت انگیز دستگاہ تھی۔ اوس نے ۱۲۸۰ء میں وفات پائی ؀

سے اسماء کا مقصد ثانیہ ظہور پذیر ہونے لگتا ہے منطق کا تعلق انہیں مقاصد ثانیہ

ہے منطق تصورات پر نہ تو اس لحاظ سے نظر ڈالتا ہے کہ وہ ابدی ہیں اور نہ اس لحاظ

سے کہ وہ محسوس اور مرئی دنیا کے مادہ میں ساری و منضم ہیں۔ بلکہ انہیں اُن موجودات

سے تعبیر کرتا ہے جنہیں عقل نے اپنی کسوٹی پر کس لیا ہے اور جن کا اُس نے آپس میں

مقابلہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ منطق کو اشیاء سے صرف اُس حد تک تعلق ہے جس حد تک

اُن میں تصورات عقلیہ کے ذریعہ سے ترمیم یا تغیر ممکن ہو بالفاظ دیگر کلیات۔ جزئیات

و مخصوصات سب ہماری سمجھ کی مختلف حالتیں یا کیفیتیں ہیں اور اُن کا مفہوم

اس عمل پر مشتمل ہے کہ جس شے کا خیال ہمارے ذہن میں آئے اُس کے جملہ تعلقات

و روابط کی توضیح کر دی جائے ذہن میں جب ایک تصور یا شکل مثالی کا تعلق متعدد

اشیاء سے قایم کیا جائے گا تو اس تعلق کے اعتبار سے اُس کو کلی کہا جائے گا۔ مثلاً

حیوان ایک تصور کلی ہے جس کا اطلاق ہر اُس شے پر ہو سکتا ہے جو متحرک

بالارادہ ہو۔

اب ہم اس مضمون کو اس امید پر ختم کرتے ہیں کہ ہماری قوم کا کوئی باہمت

اور ذی علم بو علی سینا کے حالات میں ایک مبسوط تصنیف مستقل

طور پر جداگانہ شایع کر کے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کرے گا

بو علی سینا کی اجتہادی عظمت اور عالمگیر شہرت حقیقت

میں اس امر کی مقتضی ہے کہ اردو لٹریچر میں جواب ترقی کے اس درجہ کو پہونچ

چلا ہے کہ علمی خیالات اس کے ذریعہ سے ظاہر کئے جا سکیں ایک "مکمل حیات"

ہم نے صرف اُس کی طب اُس کے فلسفہ اور اس کی منطق پر ریویو کیا ہے اور وہ بھی نہایت ہی مختصر حالانکہ اس کی تصانیف کے موضوع جملہ علوم رائج الوقت مثلاً دینیات۔ علم لسان۔ ریاضی۔ ہیئت۔ طبیعیات موسیقی۔ کیمیا۔ شاعری۔ علم خواص الاشیا وغیرہ پر حاوی ہیں۔ لیکن ایسے جامع حیثیات حکیم کی علمی زندگی پر ایک ماہوار رسالہ کے محدود صفحات میں پوری روشنی نہیں ڈالی جاسکتی اس کے لیے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ایک مستقل و مبسوط تصنیف کی ضرورت ہے ٭

اہل یورپ نے بو علی سینا کے علمی کارناموں کی جو قدر کی ہے وہ عالم آشکار ہے لیکن افسوس ہے کہ انگریزی قوم نے جسے اس حیثیت سے کہ دنیائے اسلام کا ایک بہت بڑا حصہ اس کے زیر حکومت ہے قدیم اسلامی علوم کی تحقیق میں دوسری مسیحی طاقتوں کے مقابلہ میں زیادہ کنج کاوی اور تدقیق سے کام لینا چاہئے تھا۔ بہت کم شوق اور دلچسپی ظاہر کی ہے۔ اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے ہم ایک طرف تو اس اعتنا اور دوسری طرف اس بے اعتنائی کا کسی قدر ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے ٭

شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی اپنی کتاب تمدن عرب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ کہ انگریزوں کی قوم نے اس لحاظ سے کہ اُس کا رجحان اصول سود مندی کی طرف ہے نظری علوم کی اشاعت میں بہت کم توجہ ظاہر کی ہے بالفاظ دیگر چونکہ نظری علوم کی تدوین و اشاعت کسب زر پر منتہی نہ ہوتی تھی لہذا اہل انگلستان نے اُس میں دلچسپی نہیں لی۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے دوسرے علما و فضلا کی طرح بو علی سینا

میں اس کے علمی کارناموں پر ریویو کیا گیا ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں جو حالات اس حکیم کے درج کئے گئے ہیں اُن کا ماخذ زیادہ تو جرمنی اور فرانسیسی تصانیف ہیں۔ البتہ حال میں جرمنی کے ایک عالم ڈاکٹر بوئر نے تاریخ فلسفہ اسلام کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ ایک انگریز نے اپنی زبان میں کیا ہے اور ہم نے اس کتاب کی ترتیب میں اس سے بہت کچھ مدد لی ہے اس کتاب کی تمہید جس سے جرمنی کا خاص محققانہ انداز مترشح ہے نہایت ہی دلچسپ ہے۔

بوعلی کی چھوٹی بڑی تصانیف سب ملا کر ایک سو سے اوپر ہوتی ہیں ان میں سے جتنی کتابیں زیادہ تر مشہور تھیں اور یورپ میں شایع ہوئیں سب بر اعظم یورپ ہی میں طبع ہوئیں انگلستان میں ایک تصنیف بھی نہیں طبع ہوئی۔ "قانون" اصل عربی میں بمقام روما ۱۵۹۳ء میں شایع ہوا۔ اس سے پہلے اس کا عبرانی ترجمہ ۱۴۹۱ء میں بمقام نیپلز شایع ہو چکا تھا۔ لاطینی میں "قانون" کا ترجمہ تیس دفع شایع ہوا۔ پندرھویں صدی میں جس قدر شرحیں اس پر لکھی گئیں سب بر اعظم یورپ ہی میں لکھی گئیں۔ البتہ "شفا" کا ایک قلمی نسخہ آکسفرڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ منطق اور مابعد الطبیعات پر بوعلی نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ بر اعظم یورپ میں کئی کئی دفعہ چھپیں۔ مابعد الطبیعات وینس میں ۱۴۹۳ء ۱۴۹۵ء اور ۱۵۴۶ء میں طبع ہوئی۔ بوعلی سینا کی ایک تصنیف "فلسفہ مشرقیہ" کے نام سے موسوم ہے جس میں اس کا رجحان مسئلہ ہمہ اوست کی طرف ابن رشد کے خیال کے

(فلسفہ مشرقیہ) کا ذکر راجر بکین کرتا ہے جواب گم ہو گئی ہے۔ لیکن علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ جب وہ مصر و شام اور ٹرکی کے سفر کو تشریف لے گئے تھے تو قسطنطنیہ کے شاہی کتب خانہ میں "فلسفہ مشرقیہ" کا ایک نسخہ ان کے ملاحظہ سے گذرا تھا۔ چونکہ وقت بہت کم تھا اس لئے علامہ ممدوح اس کتاب کو بالاستیعاب ملاحظہ نہیں فرما سکے؛

جن کتابوں میں بو علی سینا کے حالات یورپین زبانوں میں مل سکتے ہیں ان کا اکثر حصہ فرانسیسی اور جرمنی میں ہے انگریزی میں اس مضمون پر ایک کتاب بھی مجلداً نہیں لکھی گئی؛

~~١٨٤٩~~

<u>١٢٦٩ع</u>

فلسفه ابن سينا

# فلسفۂ ابن سینا

یعنی

شیخ الرئیس بوعلی بن عبداللہ بن سینا کے

سوانح زندگی اور اُن کے فلسفہ پر مفصل تبصرہ

جس میں

یورپ نے آج تک اُن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے

اُس کی مکمل تشریح و تنقید کی گئی ہے

تالیف

مولوی ظفر علیخاں بی - اے - ایڈیٹر "زمیندار" لاہور

سنہ ۱۹۱۴ء

مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور

پرنٹر و پبلشر: راجہ غلام قادر خاں

# دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلّی علی نبیہ النّبیہ الکریم وعلی الذین اتّبعوہ باحسان وھم والی الصراط المستقیم

---

اسلام کے فضائل بھی عجیب و غریب تھے۔ جاہلیّت کے گہوارہ میں اُس کی ولادت ہوئی، جہالت کے آغوش میں پرورش ہوتی رہی، بے علمی کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا رہا۔ اصول فطرت کی ہر چیز پر حکومت ہے اور ہر شے انھیں فطری اصول کے مطابق اپنے ماحول دار و گرد کے اثر سے متاثر ہوا کرتی ہے، عیسائیت غیر تعلیم یافتہ شخصیتوں کے گھر میں تربیت پذیر ہوئی تھی، اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک یہ اثر قایم رہا۔ کہ پاپائی مذہب کے خلاف علمی تحقیقات کرنیوالوں کے لئے خدا کی بادشاہی میں جگہ نہ تھی۔ ان کو ریشن کونسل کو ان کی تعذیب و تعزیر

[illegible]

تعلیمات میں دیکھو تو کہ برہمنوں کے علاوہ کسی دوسری ہندو قوم کو طلب علم کی اجازت نہیں۔ کلکتہ کے تین سو مشہور ہندو پنڈت اس روشنی و تمدن کے زمانہ میں بھی ۱ر مارچ ۱۹۱۴ء کو جلسہ کرتے ہیں اور طلب علم کے لئے ولایت کے سفر کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ۱۶ر مارچ ۱۹۱۴ء کو ہائی کورٹ الہ آباد سے بھی ایسا ہی فیصلہ ہوتا ہے کہ مسلمان اگر کہیں تو کہسکتے ہیں کہ تعلیم کے لئے عرب سے چین تک سفر کرنا فرض ہے مگر ہندو تو سمندر پار گئے کہ ہندو قومیت و مذہب سے خارج ہو گئے۔ ان موثرات کی حکومت سے واقع ہیں کائنات کا کوئی ایک جزو بھی آزاد نہیں باایں ہمہ اسلام کی گوناگون خصوصیتوں پر غور کرو کہ ایک بے علم سوسائٹی سے اٹھتا ہے اور ایک جہان کو علم و فن کا مخزن بنا دیتا ہے ؛

یہودیوں کے مدارس (وہ درس گاہیں جہاں تورات و تلمود وغیرہ مذہبی کتابوں کا درس ہوتا ہے) عیسائیوں کی خانقاہیں، ایرانیوں کے آتشکدے قدیم ہندوؤں کے پاٹھشالے۔ یونانیوں کی اکیڈیمی۔ اور مصریوں کے ہیکل پہلے بھی تھے جن میں پوجاریوں اور مذہبی جماعتوں کے لئے حصول علم کے موقع حاصل تھے۔ مگر نہ تعلیم عام تھی نہ قوم میں علمی زندگی کا شائبہ تھا۔ اور نہ خود علم ہی میں کوئی اصول و نظام موجود تھا ؛

موجودہ علوم و فنون کی نسبت یہ بتانا دشوار ہے کہ فلاں علم کا واضع اول کون تھا؟ علوم و فنون حسب ضرورت نکلے۔ اور جس قدر ضرورتیں بڑھتی گئیں۔ ان میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ گنتی حساب کا ایک جزو ہے۔ اشکال جیامیٹری میں داخل ہیں۔ سیاروں کی چال علم ہیأت سے متعلق ہے تسخیر، شادی۔ حرارت ملایمت۔ اور احتراق کو سائنس سے دخل ہے۔ پتھر اور مٹی سے واقفیت جیالوجی

منطق کا کام ہے۔ ان علوم میں خاص کر ریاضیات و فلکیات و طبیعیات کی ضمن میں مثلاً یہ دریافت کر لینا کہ جمع و تفریق کے قاعدے کس نے نکالے۔ ابتدائ اعداد کے مراتب کس نے معین کئے۔ ستارہ شناسی کا آغاز کس سے ہُوا۔ مادۂ اشیا پر پہلے پہل کس نے توجہ کی۔ نہایت مشکل امر ہے۔ ضرور ہے کہ ان باتوں کی ضرورت انسان کو ابتدا ہی میں پڑی ہو۔ شکاری شکار کو گنتے ہیں چرواہے بھیڑ بکریوں کو جمع یا تقسیم کر رہے ہیں۔ کسان کھیت ناپ رہا ہے۔ رات کو کہیں آنے والے جانے والے ستاروں کی سمت درست کرتے ہیں۔ یہ سب فطرت کی ابتدائی باتیں ہیں یہیں سے علوم کی بنیاد پڑتی ہے اور ترقی ہوتے ہوتے یہی انتہائی باتیں قرار پاتی ہیں ۞

ضرورت اُمّ الاختراع ہے۔ اعراب فینیقیہ (فنیشیا) تاجر تھے، لین دین کی ضرورت سے اُن کو حساب کی حاجت محسوس ہوئی ہوگی ہندوستان اور مصر کے باشندے زراعت پیشہ کھیتوں کی تقسیم اور زمین کو سبز حاصل بنانے کی غرض سے ہندسہ و مساحت کی طرف متوجہ ہوئے ہونگے یونانی و کلدانی اوقات مقررہ پر اپنے معبودوں کی عبادت کیا کرتے تھے، غالباً اسی ضرورت سے اجرام فلکی کے طلوع و غروب کے قاعدے مرتب کئے ہوں گے ۞

قاعدے شدہ شدہ بنتے ہیں۔ یک لخت نہیں بنائے جاتے، جتنے علوم ہیں ایک خفیف مادہ سے رفتہ رفتہ جسمیت تک ترقی کی ہے۔ اور بساطت کے بعد ترکیب پیدا ہوئی ہے۔ ایک شخص نے چار پھل توڑے، دو خود لئے اور دو ایک دوست کو دئے۔ غور کرو تو علم حساب کا وہی موجد ہے اور مساوات قسمت کا فن اُسی کی اختراع ہے۔ علم در حقیقت چیزوں میں ٹھیک شناخت اور صحیح معرفت قایم رکھنے کا نام